Date of Publication : 09-11-2014
PRICE Rs. 2/-

POSTED AT N.D.P.S.O, New Delhi-01
ON 10-11 Nov. 2014 R.N.I No. 2186/57

POSTAL REGN. NO. DL (C) -01/1195/2012-14
Licensed to Post Without PrepaymentU (C) 160/2012-14

HAMARI ZABAN (WEEKLY)

ہفت روزہ

ہماری زبان

انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی

15-21 November 2014
Issue: 43, Vol.:73

۱۵ تا ۲۱ نومبر ۲۰۱۴ء
شمارہ نمبر: ۴۳، جلد نمبر: ۷۳

ہندستان میں اردو تعلیم کے احیا کے لیے

وسیع تر جولان گاہوں کی تلاش

ہر چند کہ ہندستان میں اردو دانش وروں خصوصاً شمالی ہند کے اردو سیاست دانوں کے ذہن اردو تعلیم کے سیاق و سباق میں ابھی بھی جالوں سے بھرے پڑے ہیں مگر اردو معاشرے میں اس امر پر استصواب ہو چکا ہے کہ اردو تعلیم کا تحفظ صرف اور صرف اسکول کے نظام میں ممکن ہے اور اس کام کے لیے ذہن کے جالوں کو صاف کرکے ماضی سے مختلف خطوط یعنی اخبارات میں بیانات چھپوانے کی خواہش کو خیرباد کہہ کر عملی تحریک چلانی ہوگی۔

ہندستان جیسے ملک میں مسلم لسانی اقلیت جیسے پسماندہ طبقے کی اکثریت کے لیے یہ ممکن ہی نہیں کہ وہ سرکاری اسکولوں کے سوا اپنے بچوں کی تعلیم کے لیے کسی اور قابل عمل لائحہ عمل کے ذریعے اردو تعلیم کے تباہ شدہ نظام کو استوار کر سکیں۔

یہاں میں مختصراً دینی مدارس میں اردو تعلیم کے نظام کے بارے میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ دینی مدارس کے اپنے مقاصد ہیں اور اردو ادب ہمیشہ سے ہی مذہبی عمائدین کے لیے کفر سے مترادف رہا ہے۔ مولانا اشرف علی تھانوی نے 'بہشتی زیور' میں ان ادبی کتابوں کی ایک پوری فہرست شائع کی ہے جن کا مطالعہ تھانوی صاحب کے مطابق مسلم عورتوں کو نہیں کرنا چاہیے۔ دینی مدارس کے نصاب میں چوں کہ اردو ادب شامل ہی نہیں ہوتا، اس لیے، وہاں کے فارغین کو اکثر صورتوں میں اردو ادب کے خلقیے اور اس کی سیکولر روایت کا اندازہ ہی نہیں ہوتا۔ اس لیے، اگر دینی مدارس کے نصاب میں اردو ادب شامل بھی ہو گیا تو وہ مزید خلفشار کا سبب ہی بنے گا۔ دینی مدارس سے اردو تعلیم کے احیا کے سلسلے میں کوئی توقع کرنا حکومت کو اسکول کے نظام میں اردو تعلیم کے نظم کی راہ ہموار کرنے کی کوششوں سے دامن بچانے کی راہ ہموار کرنے کے سوا کچھ نہیں۔

ہمیں یہ بات ایک لمحے کے لیے بھی نہیں بھولنی چاہیے کہ دینی مدارس کے سیاق و سباق میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ دینی مدارس کے اپنے مقاصد تھے اور ہیں جو مذہب کے تحفظ اور مذہبی تعلیم سے جڑے ہوئے ہیں۔ تقسیم کے وقت علما کی بڑی تعداد کے پاکستان ہجرت کر جانے کی وجہ سے دینی مدارس کی ترجیحات ہی تبدیل ہو گئیں۔ دینی مدارس میں بھی ایسے اساتذہ کی تعداد کم سے کم رہ گئی جو عربی کے ذریعے درس نظامی پڑھا سکیں، اس لیے اردو دینی مدارس کا ذریعۂ تعلیم بن گئی۔ دینی مدارس کے اساتذہ میں فارسی سے واقفیت رکھنے والوں کی تعداد بھی تقریباً معدوم ہو گئی۔ اب بڑے سے بڑے دینی مدارس کے اساتذہ فارسی سے کم و بیش ناواقف ہی ہیں۔

دینی مدارس نے اردو کو ذریعۂ تعلیم بنا کر اردو رسم خط کے تحفظ میں تو اہم رول ادا کیا مگر اردو ادب کے فروغ کے لیے کچھ بھی اس لیے نہیں کیا کہ وہ ان کے ایجنڈے میں شامل ہی نہیں تھا۔ دینی مدارس سے اردو ادب کے فروغ کی توقع کرنا بھی بے جا ہی ہے۔ قدیم اردو معاشرہ جس صالح اقدار کا امین تھا اس کی تشکیل میں اردو اور فارسی ادب کا اہم رول تھا۔ تقسیم کے بعد ہمارے معاشرے میں ادب کی جگہ مذہب نے لے لی ہے یوں معاشرے کی نفسیات ہی تبدیل ہو گئی۔

بالفرض محال اگر صوبائی حکومتیں اردو تعلیم کے نظم کے سلسلے میں کوئی پیش رفت کریں بھی تو ان کی رہنمائی کون کرے گا؟ میرا ذہن اس سلسلے میں بالکل صاف ہے کہ اس کام میں صوبائی اردو اکادمیوں کو ملوث کیا جائے۔ ہر چند کہ صوبائی اردو اکادمیوں کو اس سلسلے میں ابھی کوئی تجربہ نہیں اور وہ اپنے اپنے صوبوں میں اس اردو ادب کے فروغ کی دکان چلا کر اپنا وجود بچائے ہوئے ہیں جہاں اردو تعلیم کا کوئی نظم ہی نہیں، اس لیے، خراب سے خراب مسودے کو ہر صوبے کی اردو اکادمی اور بعض صوبوں میں دیگر سرکاری ادارے بھی مدد دینے کے لیے تیار رہتے ہیں مگر اشاعت کے بعد ان تخلیقی ادب کی کتابوں خصوصاً شاعری کے مجموعوں کو ان کے پست ترین معیار کی وجہ سے کوئی مفت میں پڑھنے کو بھی تیار نہیں ہوتا۔

اردو تعلیم کے سلسلے میں دہلی اردو اکادمی کی مثال ہمارے سامنے ہے جس کے پاس اسکولوں کی تعلیم کے نظم کا کوئی مینڈیٹ نہیں مگر حکومت دہلی نے صوبے میں اردو تعلیم کے نظم خصوصاً اردو اساتذہ کے تقرر کی ذمے داری دہلی اردو اکادمی کے سپرد کر دی جس نے بدترین حالات میں اگر اس ذمے داری کو اپنے ذمے نہ لیا ہوتا تو دہلی کے اسکولوں میں اردو اب تک ختم ہو چکی ہوتی۔ دہلی اردو اکادمی کے کارکنان اور آتے جاتے اراکین کو اسکول کی سطح پر تعلیم کے نظم کا کوئی تجربہ نہ تھا مگر آہستہ آہستہ انھیں بات سمجھ میں آنی شروع ہوئی۔ یہی صورت دیگر اردو اکادمیوں کے سلسلے میں بھی ہوگی کہ اول وہ غلطی پر غلطی کریں گے اور اردو کے مقامی سیاست داں ذاتی مفادات کے سلسلے میں رائی کا پہاڑ بنائیں گے، اس لیے، صوبائی اردو اکادمیاں اسکول کی سطح پر نہ صرف اردو تعلیم کے احیا کے راستے میں آنے والی رکاوٹوں سے واقف ہو جائیں گی بلکہ اگر اردو دنیا نے صوبائی حکومتوں کو دباؤ میں لے لیا تو آخرش اردو اکادمیوں کو اپنے اپنے صوبوں کے اسکولوں میں اردو تعلیم کے لیے nodal agency بنایا جا سکتا ہے۔

ایسی صورت حال میں جب خود اردو والے اردو تعلیم کے متعلقات سے قطعاً ناواقف ہیں، صوبائی حکومتوں سے اسکولوں میں اردو تعلیم کا احیا کرنے کی امید کرنا انتہائے حماقت کے سوا کچھ نہیں۔ اسکولوں میں اردو تعلیم کے بغیر اردو کا احیا ممکن نہیں مگر اس کام کو کرنے کے لیے ادارے موجود ہی نہیں، ایسے میں جو موجود ہیں ان سے کام چلانے کے سوا چارہ نہیں اور صوبوں میں اردو اکادمیاں، جن کا نظام کتنا ہی ناکارہ کیوں نہ ہو، سر دست وہ واحد ادارے ہیں، جنھیں اسکولوں میں اردو تعلیم کے احیا کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ مگر اردو اکادمیاں اپنے اپنے صوبوں میں اردو تعلیم کی ذمے داری کیسے سنبھالیں، اس کے لیے قومی اردو کونسل کو ان کی ایک میٹنگ جلد از جلد منعقد کرنی چاہیے۔

●○●

اطہر فاروقی

اس شمارے میں

۱۸؍نومبر کو شبلی نعمانی کی یوم وفات ہے، اس مناسبت سے پروفیسر علی احمد فاطمی کا مضمون 'شبلی اور انجمن ترقی اردو (ہند)' اور ممتاز ادیب اور شبلی کے ہم عصر مولانا عبدالحلیم شرر کی اہم اور نایاب تحریر 'شبلی نعمانی' اس شمارے میں شائع کی جارہی ہیں۔ (ادارہ)

شبلی نعمانی

مولانا عبدالحلیم شرر

مولانا شبلی کی وفات سے مسلمانوں میں جو کمی ہوگئی ہے اس کا پورا ہونا بہت دشوار ہے۔ ہندستان میں بہت سے علما فضلا پیدا ہوں گے، بہت سے شعرا پیدا ہوں گے، بہت سے مصنف پیدا ہوں گے، بہت سے انگریزی کے فاضل و متبحر پیدا ہوں گے مگر شبلی پھر پیدا ہوں یہ ممکن نہیں۔ وہ اس عالم سرمدی میں گئے اور جنت میں، جہاں سے کوئی واپس نہیں آتا، کسی کی یاد میں تو وہ دیکھا کرتا اسے ستاتا ہے۔ لہٰذا ہم اپنی آہ و زاری سے ان کی وہاں کی ابدی مسرت و فارغ البالی میں فرق نہ ڈالتے اور انھیں نہ ستاتے، مگر کیا کریں کہ شبلی نہ دنیا میں کوئی اپنا نظیر چھوڑ گئے ہیں اور نہ ان کے سے محقق گراں پایہ کے پیدا ہونے کی امید ہے اور یہ ایسا غم جانکاہ ہے کہ ہمیں نہ آج ہی بےچینی سے بیٹھنے دے گا اور نہ کبھی آئندہ۔

مولانا کے علمی کارناموں کا آغاز ہماری آنکھوں کے سامنے ہوا۔ ہمارے سامنے انھوں نے ترقی کی شہرت حاصل کی اور ہماری ہی آنکھوں کے سامنے دنیا سے سدھار گئے۔ ہم سے ان سے طالب علمی کے زمانے سے ملاقات تھی ان کا سنہ ولادت تو ہمیں یاد نہیں مگر اتنا جانتے ہیں کہ ہم دو قریب العمر ہیں۔ مولانا کو ہجوم امراض قبض و بواسیر کے تکالیف اور معدے کی کمزوری نے بہت ہی ضعیف و ناتواں بنا دیا تھا جس کی وجہ سے ان کی عمر اصل سے زیادہ معلوم ہوتی تھی۔ ان کے بیان کے مطابق ان کی عمر پچپن چھپن سال سے زیادہ نہ تھی۔

ابتدائے عمر میں درسیات اور کتب معقول انھوں نے اپنے وطن میں مولوی محمد فاروق صاحب چڑیاکوٹی سے پڑھیں۔ چند روز بہ حیثیت طالب علم جونپور کے مدرسہ حنفیہ میں رہے اور غالباً مولوی ہدایت اللہ خاں صاحب مرحوم سے تحصیل کی۔ آخر میں ادب عربی کے شائق بن کے لاہور پہنچے اور مولانا فیض الحسن صاحب سے پرائیویٹ طور پر ادب کی کتابیں پڑھیں۔ شاید اسی وجہ سے پنجاب کے اخبارات میں شائع ہوا ہے کہ انھوں نے پنجاب یونیورسٹی کی ڈگریاں مولوی، عالم اور مولوی فاضل حاصل کیں مگر یہ بالکل بے اصل اور بے بنیاد ہے۔ یہ ہمیں نہیں معلوم کہ مولانا نے حدیث کی کتابیں پڑھیں یا نہیں اور پڑھیں تو کہاں اور کس سے پڑھیں؟

تحصیل علم کے بعد مولانا نے ارادہ کیا کہ قانونی پیشہ اختیار کر کے مختاری و وکالت کی سندیں حاصل کریں۔ جس غرض کے لیے چند روز تک ضلع بستی میں قیام کیا، مگر حالت اور رجحان طبیعت سے آشکارا ہو رہا تھا کہ جس میدان میں فروغ پانے کے لیے وہ پیدا کیے گئے تھے وہ میدان یہ نہیں ہے۔ چنانچہ ان دنوں اگرچہ مقدمہ بھی اور عدالتی کارروائیوں سے کام رہتا تھا مگر ان کا مشغلہ علمی مباحث اور عالمانہ تصانیف ہی تھے۔

مولانا نے جن درسگاہوں میں تعلیم پائی اور جن اساتذہ سے پڑھا ان کی صحبت نے ابتدا ہی میں انھیں سخت حنفی بنا دیا تھا۔ اسی شوق میں انھوں نے اپنے نام کے ساتھ 'نعمانی' کا لقب لکھنا شروع کیا جس کی وجہ سے بعض ناواقف لوگوں نے انھیں غلطی میں پڑ کے نسبتاً نعمانی یعنی امام اعظم ابوحنیفہ کوفی کی نسل میں خیال کر لیا مگر اس کی کوئی اصلیت و حقیقت نہیں ہے۔ وہ متشدد حنفی تھے اور حقیقت میں اپنے آپ کو اوروں سے ممتاز ثابت کرنا چاہتے تھے۔ اسی جوش کا تقاضا یہ بھی تھا کہ امام صاحب کی سوانح عمری میں انھوں نے 'سیرت النعمان' لکھی تو امام المحدثین محمد بن اسمٰعیل بخاری پر جا بجا حملے کیے اور علی العموم گروہ محدثین کے اصول سے اختلاف کیا کرتے۔ یہاں تک کہ امام ابوالحسن اشعری بھی محض اتباع حدیث کے باعث ان کے مورد سہام بن گئے۔

ان دنوں مولوی ابوالحسنات محمد عبدالحی فرنگی محلی کی درسگاہی شہرت تھی، جن کے فیض علمی سے سارا ہندستان بلکہ ممالک دور و دراز کے لوگ بھی بہرہ یاب ہو رہے تھے۔ مولانا عبدالحی صاحب کی یہ شان تھی کہ بخلاف تمام موجودہ علمائے حنفیہ کے ائمہ سلف میں سے جس کے قول کو اہل حدیث کے مذہب سے قریب تر پاتے اختیار کر لیتے اور بہت سے مسائل میں اہل حدیث کے ہم خیال تھے۔ چنانچہ نماز میں امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ پڑھنے کے بارے میں انھوں نے امام محمد کا مذہب اختیار کر لیا تھا اور سورۂ فاتحہ پڑھنا مستحب بتاتے تھے۔ یہ امر مولانا شبلی کو سخت ناگوار ہوا۔ چنانچہ ان کی تردید میں ایک عربی رسالہ لکھ کے شائع کر دیا جس کا نام 'اسکات المعتدی' تھا اور جیسے ہی اس کی اشاعت ہوئی اس کی تردید میں مولوی عبدالحی صاحب مرحوم کے فاضل شاگردوں میں سے مولوی نور محمد صاحب ملتانی مرحوم اور ملا شعیب نے اپنے اپنے رسالے شائع کیے جن میں علاوہ نفس مسئلہ کے ادبی غلطیاں بھی نکالی تھیں۔

مولانا انھی بحثوں میں پڑے ہوئے تھے کہ علی گڑھ کالج کو عربی کے ایک اچھے ادیب اور فاضل مدرس کی ضرورت ہوئی، انھوں نے مولوی فیض الحسن صاحب کی تصدیق و سفارش سے درخواست بھیجی، سید صاحب نے مولانا کی درخواست کو قبول فرما لیا، چنانچہ مولانا بستی اور وہاں کے قانونی مشاغل کو چھوڑ کر لکھنؤ ہوتے ہوئے علی گڑھ گئے۔ میں اس وقت داروغہ حیدر بخش کی مسجد میں ان سے ملا تھا اور ان کے چہرے سے محسوس کر رہا تھا کہ یہاں کے طلبہ میں سے ہر ایک کو دہشت و بدگمانی کی نظر سے دیکھتے تھے، مگر باوجود اس دہشت کے طلبہ ہی میں تھے، اس لیے کہ اس وقت تک پبلک سے ان کو سروکار نہ تھا۔ علی گڑھ میں سید صاحب نے انھیں اپنی کوٹھی کے احاطے کے اندر ایک چھوٹے سے مکان میں جگہ دی جو سب سے الگ بالکل باہر اور بے ہمہ تھا اور ایک خاموش مقام تھا۔ ان میں جستجو و تحقیق کا بیّنا مذاق دیکھ کے سید صاحب نے ان سے ربط و ضبط بڑھایا۔ اکثر کھانا ایک ساتھ کھاتے اور روز گھنٹوں صحبت رہتی۔

سید صاحب ہمیشہ اعتقادی و کلامی مسائل اور سورخانہ تحقیق کے غور و خوض میں رہتے اور تحقیق و تدقیق کی غرض سے انھیں اکثر حدیث، فقہ و تاریخ و سیر کی کتابوں کے مطالعے کی ضرورت پڑتی۔ اس کام کو انھوں نے مولانا شبلی سے لینا شروع کیا اور مولوی شبلی نے اس خدمت کو ایسی خوبی اور قابلیت سے انجام دیا کہ جس قدر سید صاحب کی دقیقہ رسی و وسعت نظر کے مولانا شبلی قائل ہوتے جاتے تھے اس سے زیادہ سید صاحب ان کی تلاش و جستجو اور جلب روایات کے معتقد و معترف ہوگئے تھے۔ اس زمانے میں مجھے بارہا مولانا شبلی کے پاس جا کر ٹھہرنے اور ان کے ذریعے سے خود سید صاحب کا مہمان بن جانے اور دونوں کے ساتھ بہتوں کھانا کھانے اور شریک صحبت رہنے کا موقع ملا۔ مولانا سے مجھ سے حد درجہ کی بے تکلفی تھی اور اس بات کو ہر صحبت میں محسوس کرتا تھا کہ وہ اور سید صاحب دونوں کس قدر ایک دوسرے کے علمی کمالات کے معترف ہوتے جاتے ہیں۔ سید صاحب کے اعتراف کی تو یہ حالت تھی کہ کوئی کام بغیر ان سے مشورہ کیے نہ کرتے اور مولانا شبلی کے اعتراف کا یہ ثبوت ہے کہ میرے علم میں ان کی سب سے پہلی نظم جو ان دنوں شائع ہوئی 'صبح امید' ہے جس میں انھوں نے مسلمانوں کی غفلت اور سید صاحب کی برکت سے ان کے بیدار ہونے کو نہایت ہی پُرلطف اور موثر الفاظ میں ظاہر کیا ہے اور اسی زمانے میں علی گڑھ کے ایک طالب علمانہ تھیٹر میں انھوں نے اپنی ایک قومی نظم سنائی تھی۔ ان چیزوں نے انھیں فارسی اور اردو کا ایک مقبول عام شاعر ثابت کرنا شروع کر دیا تھا اور اس میں شک بھی نہیں کہ وہ ایک دقیقہ رس شاعر تھے اور اپنی نظموں کو ایسی لفظ خیز ذہن میں سنایا کرتے تھے کہ پبلک نے بہت پسند کیا اور طلبہ نے اسے اختیار کر کے قومی نغمہ خوانی کی ایک مقبول عام ذھن بنا کے سارے ہندستان میں پھیلا دیا، مگر پھر بھی یہ کیوں کا کہ وہ شاعر نہ تھے اور نہ شاعری کے لیے پیدا ہوئے تھے بلکہ علم کے عالم میں ان کی شان ایک شاعر کے درجے سے بہت ہی ارفع و اعلیٰ تھی۔

اب سید صاحب کی توجہ دلانے سے وہ تاریخی تنقید و تحقیق میں مصروف تھے جس کا سب سے پہلا نمونہ 'مسلمانوں کی گزشتہ تعلیم' ان کا لکچر تھا جسے انھوں نے محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے دوسرے یا تیسرے اجلاس میں پیش کیا تھا۔ یہ لکچر مسلمانوں کی نظر میں بالکل ایک نیا اور بہت ہی دل چسپ چیز تھا۔ چنانچہ جب اس پر انگلستان میں ریویو لکھا ہے تو کوئی نہ تھا جو اس کے دیکھنے کا مشتاق نہ ہو گیا ہو۔ اسی نوعیت کی ان کی دوسری کتاب 'المامون' تھی جو علی العموم بہت پسند کی گئی اور اسی کتاب نے پہلے پہل پبلک کو بتایا کہ مولانا شبلی کس قسم کے مصنف ہیں اور آئندہ کیسے ثابت ہونے والے ہیں۔ اب سید صاحب کی صحبت اور پبلک کی حوصلہ افزائی نے مولانا کو اسی کوچے میں آگے بڑھانا شروع کیا۔ 'سیرت النعمان' لکھی، 'سیرت الفاروق' لکھی اور تاریخی جستجو کا شوق اس قدر بڑھ گیا تھا کہ کتابوں کی تلاش میں قسطنطنیہ پہنچے اور واپس آ کے اپنا سفرنامہ شائع کیا جس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جس شوق میں وہاں گئے تھے وہ پورا نہ ہوا اور اسی وجہ سے ان کی یہ تصنیف بھی ایک ناکام تصنیف ہے۔

اس موقع پر ان کے خیالات کے متعلق اس نازک انقلاب کا بیان کرنا بھی لطف سے خالی نہ ہوگا کہ سید دراصل غیر مقلد اور اہل حدیث کے گروہ میں تھے، لیکن مسائل کلامی اور انگریزی اثر نے غیر مقلد سے ایک بڑی حد تک انھیں معتزلی بنا دیا تھا۔ سید صاحب کی

(بقیہ صفحہ ۶ پر)

دوسری قسط

جواہر لعل نہرو اور مولانا ابوالکلام آزاد

سوانح و افکار کی چند جھلکیاں

اسیم کاویانی (فلیٹ نمبر 702، کیمبن اپارٹمنٹ، بیلویڈر روڈ، بجگاؤں، ممبئی 400010)
E-mail: aseemkavyani@gmail.com

دیوہ و کعبہ ہی سے اس کا نہ تعلق سمجھ:

پنڈت نہرو نے اپنی آپ بیتی میں عہد طفلی کی یادوں کے دھندلکوں سے اپنے خاندان کی مذہبی روایات کا تذکرہ یوں کیا ہے کہ اُس خاندان کی عورتوں میں مذہبی رسموں اور پوجا پاٹ کا چلن پایا جاتا تھا۔ گھر کے مرد مذہبی اُمور کو اہمیت نہیں دیتے تھے اور ہنسی میں ٹال دیتے تھے۔ نہرو اپنی زندگی میں کہیں بھی اس سچائی کے اظہار میں نہیں ہچکچائے کہ وہ مذہب اور خدا میں یقین نہیں رکھتے۔ گاندھی جی کے نام اپنے ایک خط میں انھوں نے لکھا تھا:

''میں پیدائشی طور پر ہیکن (Pagan) ہوں، غیر مذہبی۔ آپ کی طرح اخلاق پرست نہیں اور میں شان دار ہیکن طاقت اور زندگی کی طرف اپنے اسلاف کا رویہ عزیز رکھتا ہوں، اُن کی تمام خوبیوں اور کمزوریوں سمیت۔ میں ہر طرح کے حسن میں، زندگی کی تہ داری میں، انسانی مزاج کی دانش مندانہ تفہیم میں اُن کی مسرت آمیز دل چسپی سے محبت کرتا ہوں''[12]

انھوں نے اپنی آپ بیتی میں لکھا ہے کہ ''...موجودہ دور کا مذہب ایک خالی برتن کی طرح ہے، جس کے اندر کوئی حقیقی شے نہیں اور یاد دلاتا ہے کہ چسٹرٹن نے بھی مذہب کا موازنہ Fossil سے کیا ہے، جو کسی ایسے جانور یا مخلوق کی بس ہیئت ہے، جس کے تمام اندرونی اجزا غائب ہو چکے ہیں مگر شکل برقرار ہے، کیوں کہ اس کے اندر بالکل مختلف قسم کی چیزیں بھر دی گئی ہیں۔''[13] وہ ہندوستانیوں کی قدامت پسندی اور روایت پسندی سے سخت نالاں تھے Selected Works کی چھٹی جلد میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

''...ہم کنوئیں کے مینڈک کی طرح سمجھتے ہیں کہ کائنات کا مرکز یہی (فرسودہ روایات) ہیں اور تمام علم اور نیکیاں ہمارے اندر موجود ہیں اور ہمیں کہیں کچھ ڈھونڈنے اور دریافت کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ قدرت نے آخر ہم سے اپنا بدلہ لے ہی لیا۔ دنیا آگے بڑھ گئی اور ہمیں اپنے توہمات اور رسموں کی دلدل میں کھڑا ہوا پیچھے چھوڑ دیا۔''

مذہبی افتراق اور فرقوں کے خلاف اُن کا غم و غصہ جابجا اُن کی تحریروں میں جھلک پڑا ہے۔ ایک جگہ رقم طراز ہیں:

''ہندوستان کو بہت زیادہ مذہبی ملکوں میں سے ایک سمجھا جاتا ہے۔ جہاں ہندو، مسلم، سکھ اور دیگر مذہب کے ماننے والوں کو اپنے اپنے عقیدوں پر بڑا فخر ہے اور وہ لوگ ان عقیدوں پر اپنے ایقان کا ثبوت ایک دوسرے کا سر توڑ کر دیا کرتے ہیں۔ وہ شے جسے مذہب یا منظم مذہب کہتے ہیں، ہندوستان میں یا کہیں اور، اس کا تماشا مجھے خوف زدہ کر دیتا ہے۔ میں نے متواتر اس کی مذمت کی ہے اور یہی چاہا ہے کہ اسے اچھی طرح سمیٹ کر پھینک دیا جائے۔ سچ تو یہ ہے کہ مذہب ہمیشہ سے رجعت پسندی، دوغلاپن، کٹ ملائیت، توہم پرستی، استحصال اور ذاتی مفاد کا ترجمان رہا ہے''۔

انھیں مذہب کے جامد اور ناقابلِ ترمیم ضابطے اور گناہ و اخلاق کے مابعد طبیعاتی معیار مطمئن نہیں کرتے تھے۔ اُن کا کہنا تھا کہ کسی قوم کی اخلاقی و روحانی حیثیت کو اسی دنیا کے معیاروں سے جانچنا چاہیے اور یہ کہ محض نظر اور حسب ذہنیت کو اپنے ضمیر کی جگہ نہیں دی جا سکتی۔ ایک جگہ رقم طراز ہیں کہ ''الفاظ ترسیل کا کوئی بہت مکمل ذریعہ نہیں ہیں، جس پر مذہبی اصطلاحوں کی کثرت اور ان کے معنوی تضادات کے ہجوم پر لاتعداد مذاکروں اور بحثوں نے تو زبردست اُلجھاوے پیدا کر دیے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج ہر مذہب اپنی حقیقی معنویت کھو چکا ہے۔''

مولانا آزاد کا قلم بھی زندگی بھر تقلیدی مذاہب اور فرسودہ روایات کے خلاف شمشیر برہنہ بنا رہا تھا۔ اُن کا ماننا تھا کہ جب تک موروثی عقائد کے جمود اور تقلیدی ایمان کی چشم بندیوں کی پٹیاں ہماری آنکھوں پر بندھی رہتی ہیں، ہم راہ حقیقت کا پتا نہیں لگا سکتے۔[14] ہم دیکھتے ہیں کہ وہ اپنے والد کے مذہبی مسلک کو ہدف تنقید بنا کر اپنے خاندان کے باغی بھی کہلائے تھے۔

بہر کیف مولانا کا اصلاحی تشخص ہمارے ذہنوں پر اس طرح چھایا ہوا ہے کہ وہ دین کی لاگ کے بنا ایک قدم بھی نہیں توڑتے ہوں گے۔ ایسے میں کسی کو حیرت ہو سکتی ہے کہ نہرو جیسے دہریے اور مولانا جیسے عالم دین میں کس طرح گاڑھی چھنتی تھی اور وہ کیوں کر ساری زندگی دل و جان سے ایک دوسرے کے قدر دان رہے!

دراصل مولانا آزاد نے دین واحد سے لے کر وحدت ادیان تک کا جو سفر طے کیا تھا، اُس منزل پر مذہب انسانیت کی وہ بنیادی قدریں روشن ہیں، جو انھیں صرف یکجا کر سکتی ہیں اور وہاں کوئی خلیج حائل نہیں رہتی۔

مولانا نے 'غبار خاطر' کے ایک خط میں لکھا ہے:

''...ایک مذہب تو موروثی مذہب ہے کہ باپ دادا جو کچھ مانتے آئے ہیں، مانتے رہیے۔ ایک جغرافیائی مذہب ہے کہ زمین کے کسی خاص ٹکڑے میں ایک شاہ راہ عام بن گئی ہے، سب اسی پر چلتے ہیں، آپ بھی چلتے رہیے۔ ایک مردم شماری کا مذہب ہے کہ مردم شماری کے کاغذات میں ایک خانہ مذہب کا بھی ہوتا ہے، اس میں اسلام درج کرا دیجیے۔ ایک رسمی مذہب ہے کہ رسموں اور تقریبوں کا ایک سانچا ڈھل گیا ہے، آنسے نہ چھیڑیے اور اسی میں ڈھلتے رہیے۔ لیکن ان تمام مذہبوں کے علاوہ بھی مذہب کی ایک حقیقت باقی رہ جاتی ہے۔ تعریف و امتیاز کے لیے اسے حقیقی مذہب کے نام سے پکارنا پڑتا ہے اور اسی کی راہ گم ہے۔''

ہمیں ورق گردانی کے اثنا میں ایسے اس مقام پر پہنچ کر یہ حقیقت بھی بے نقاب ہوئی کہ علم اور مذہب کی چشمک بے جا ہے، وہ فی الحقیقت علم اور مذہب کی نہیں ہے، مدعیان علم کی خام کاریوں اور مدعیان مذہب کی ظاہر پرستیوں اور قواعد سازیوں کی ہے۔ حقیقی علم اور حقیقی مذہب اگرچہ چلتے ہیں الگ الگ راستوں سے، مگر بالآخر پہنچ جاتے ہیں ایک ہی منزل پر۔[15] یہی وہ منزل ہے جہاں ہیرو اور کیمبرج کے تعلیم یافتہ نہرو اور اپنے والد اور نجی اساتذہ کے ذریعے فارغ التحصیل مولانا آزاد اپنے اپنے پیام میں اشتراک اور اکبر کی طرح ہم آواز نظر آتے ہیں۔ یہاں تک کہ اُن کی 'پنڈت' اور 'مولانا' کی نسبتیں معدوم ہو جاتی ہیں۔ دراصل وہ ایسے نرالے پنڈت اور انوکھے مولانا تھے، جہاں تشقہ دھاری پنڈتوں اور دو رکعت کے اماموں کی فہم کی رسائی نہ ہو سکتی تھی۔

زبان کا مسئلہ اور نہرو

مشہور ہے کہ جب آئین ساز اسمبلی میں زبانوں کا مسئلہ زیر بحث آیا تھا تب آٹھویں شیڈول میں شامل کرنے کے لیے زبانوں کی فہرست میں نہرو نے اردو کا نام بھی پیش کیا تھا۔ اُس وقت ہندی کے ایک کٹر حامی نے اعتراض کیا تھا کہ اردو بھلا کس کی مادری زبان ہو سکتی ہے؟ نہرو نے انھیں سخت لہجے میں جواب دیا تھا کہ اردو میری ماں اور دادی کی زبان ہے۔ نہرو کے والد موتی لعل بھی اردو اور فارسی بخوبی جانتے تھے۔ جواہر لعل کی شادی کا رقعہ بھی اُردو میں چھپا تھا۔ جس میں موتی لعل نہرو نے بغیر کسی آرائشی عبارت کے بیٹے کی نسبت، بیاہ کی تاریخ اور تقاریب مابعد کی اطلاع اور شرکت کی دعوت کو ایک خطِ مرکب میں سمونے کی دل چسپ کوشش کی تھی۔ اگرچہ نہرو کے لیے انگریزی ذریعہ تعلیم کا انتخاب کیا گیا تھا اور انھوں نے ہیرو اور کیمبرج میں اعلا تعلیم حاصل کی تھی۔ وہ انگریزی کے ایک مقبول مصنف بھی تسلیم کیے گئے۔ کسی نے اُن کے تعلق سے یہ بھی کہا تھا کہ 'وہ سوچتے انگریزی میں اور بولتے اردو میں ہیں'۔ مولانا آزاد نے بھی 'غبار خاطر' میں نہرو کی نیند میں خراٹے لینے کی عادت کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''خراٹے جب تھمتے ہیں تو حسب معمول نیند میں بڑبڑانے لگتے ہیں۔ یہ بڑبڑانا ہمیشہ انگریزی میں ہوتا ہے۔'' یہاں بھی نہرو نے احمد نگر میں اپنی تقریباً تین سالہ حراست کے دور میں ڈاکٹر سید محمود اور مولانا آزاد سے نہ صرف اردو پڑھی بلکہ مولانا سے فارسی کے بھی کچھ درس لیے تھے۔ انھوں نے اس حد تک اردو سیکھ لی تھی کہ وہ نہ صرف ہمیں اردو میں مراسلت کرتے نظر آتے ہیں بلکہ اپنی جیل کی ڈائری اور مکتوبات میں اردو اشعار ٹانکتے اور اندرا کے لیے بہت سے اردو اشعار کی تشریح بھی کرتے ملتے ہیں۔ ان تحریروں میں غالب، میر، اقبال، آتش، درد، مومن، ذوق، حالی اور اکبر کے ساتھ ساتھ وزیر، امیر، مرزا جان جاناں مظہر، جرأت اور انشا جیسے شعرا کا حسن انتخاب ہمیں متحیر کر دیتا ہے۔ قلعہ احمد نگر کی حراست میں اُن کی پڑھی ہوئی

(بقیہ صفحہ ۶ پر)

اردو دنیا

اسکولوں میں اردو کی تدریس کا نظم قائم ہو

بہرائچ، یوپی (۲۰ اکتوبر)۔ اردو صرف ایک زبان ہی نہیں بلکہ یہ تہذیب بھی ہے، اردو کی ترقی و بقا کے لیے ضروری ہے کہ درجہ آٹھ تک لازمی طور پر اردو پڑھائی جائے، اردو والے اپنے گھروں میں اردو کے اخبارات و رسائل ضرور منگائیں اور اپنے بچوں کو دوسری زبانوں کے ساتھ اردو کی بنیادی تعلیم ضرور دیں تاکہ بچے تہذیب یافتہ ہو سکیں۔ مذکورہ خیالات کا اظہار محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامہ اترپردیش کے اسسٹنٹ ڈائرکٹر ڈاکٹر وضاحت حسین رضوی نے ناظر پورہ واقع فلکس ہاؤس میں الفلاح فاؤنڈیشن کے تحت منعقد اردو کانفرنس میں سامعین کو خطاب کرتے ہوئے کیا۔

ڈاکٹر وضاحت رضوی نے کہا کہ موجودہ حکومت اردو کی ترقی کے لیے کوشاں ہے، اردو اکادمی اور فخرالدین علی احمد کمیٹی جیسے ادارے کی مختلف اسکیموں کا فائدہ اٹھانا چاہیے۔ انھوں نے کہا کہ اردو ہمیشہ زندہ رہے گی، لیکن ضرورت ہے کہ نئی پود تیار رہے جو اردو زبان و ادب کی خدمت کرتی رہے، اردو کے فروغ میں اردو کی تنظیمیں آگے آئیں اور یہ نعرہ بلند کریں، اردو پڑھیں، اردو بیچیں اور اردو بولیں، اردو میں ہی دستخط کریں۔ انھوں نے لوگوں سے بالخصوص مسلمانوں کو اپنے بچوں کو اچھی تعلیم کے ساتھ ساتھ اردو پڑھانے پر زور دیا۔

معروف صحافی محمد علی نے کہا کہ اردو ایک توانا زبان ہے، اپنا رشتہ اردو سے جوڑیے اور بچوں کی تعلیم کے لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ محلہ محلہ میں ایسی کمیٹیوں کی تشکیل کی جائے جو اردو کے فروغ کے لیے نئی نسل کو اس کی جانب راغب کریں، ورنہ ایک دن یہ آئے گا کہ یہ زبان صرف لائبریریوں تک ہی محدود ہو کر رہ جائے گی۔ پرائمری سطح پر ہی اردو کی تعلیم کی سخت ضرورت ہے۔

(راشٹریہ سہارا۔ دہلی)

کانگریس اپنا وعدہ پورا کرے

وزیر اعلا سدرامیا سے اردو ہال کی تعمیر کے لیے اقدام کرنے کا مطالبہ

بیدر، کرناٹک (۱۳ اکتوبر)۔ جناب محمد جعفر (سابق چیئرمین اور موجودہ رکن گرام پنچایت الماپور تعلقہ بیدر)، عبدالسلیم (صدر ایس ڈی ایم سی سرکاری اردو ہائی اسکول الماپور)، محمد یونس صدیقی (نائب صدر ایس ڈی ایم سی سرکاری اردو ہائی اسکول الماپور)، جناب عبدالکریم پٹیل (رکن ایس ڈی ایم سی الماپور) نے ایک مشترکہ بیان جاری کرکے وزیر اعلا کرناٹک جناب سدرامیا سے مطالبہ کیا ہے کہ وہ بنگلور میں اردو ہال کی تعمیر کے لیے فوری اقدام کریں۔ انھوں نے بتایا کہ کرناٹک اردو اکیڈمی کی تشکیل ہوئے چار ماہ گزر چکے ہیں پانچواں مہینہ چل رہا ہے اور مالی سال ختم ہونے میں مزید چار ماہ باقی ہیں، اکیڈمی کی طرف سے بنگلور میں اردو ہال کی تعمیر کے لیے ایک کروڑ 20 لاکھ روپے مختص کرنے کی بات اخبارات کے ذریعے اور اکیڈمی کی چیئرپرسن فوزیہ چودھری کی تقاریر کے ذریعے سامنے آئی تھی، اب صرف چار ماہ باقی ہیں ایسے میں کیا اکیڈمی اپنے اس فنڈ کا استعمال کر سکے گی؟ اس بات کو لے کر ریاست کی اردو عوام یہاں تک کہ مواضعات میں رہنے والوں میں بھی تشویش کی لہر ہے۔ ریاست کے وزیر جناب قمرالاسلام اردو ووٹوں کے ذریعے اپنے حلقے میں چھ مرتبہ جیت سے ہمکنار ہوئے ہیں یہاں تک کہ اردو عوام نے انھیں ایم پی بھی بنایا تھا، ان کی متعلقہ وزارت بنگلور میں اردو ہال کی تعمیر میں لیت و لعل سے کام لے رہی ہے جو حیرت انگیز بات ہے۔ آج الماپور جیسے دیہات میں سرکاری اردو پرائمری اسکول ہی نہیں سرکاری اردو ہائی اسکول بھی موجود ہیں۔ مذکورہ ذمہ داران الماپور نے اقلیتی بہبود کے وزیر قمرالاسلام صاحب اور ریاست کے وزیر اعلا سدرامیا سے گزارش کی ہے کہ وہ بنگلور میں اردو ہال کی تعمیر میں خصوصی دلچسپی لے کر متعلقہ وزیر سے اردو ہال کی بابت دریافت کرتے ہوئے مالی سال کے ختم تک اردو ہال کی تعمیر کا حکم دیں اور اپنا وعدہ پورا کریں۔

(سالار۔ بنگلور)

اورینٹل کالج کاچیگوڑہ میں لیکچررس کی اسامیوں پر تقرری

حیدرآباد (۲۳ اکتوبر)۔ محکمۂ اعلا تعلیم حکومت تلنگانہ کی جانب سے انجمن خادم المسلمین رفاہ عام اورینٹل کالج کاچیگوڑہ حیدرآباد میں عربی لیکچررس کی تین خالی اسامیوں پر تقرر کے لیے احکام جاری کیے گئے ہیں۔ انجمن خادم المسلمین رفاہ عام اورینٹل کالج کاچیگوڑہ کا قیام 1967-68 کے تعلیمی سال میں عمل میں آیا تھا۔ اس کالج میں 17 اسامیوں کی منظوری دی گئی جس میں سے اس وقت صرف تین برسر خدمت ہیں جب کہ 14 اسامیاں خالی ہیں۔ حکومت کی جانب سے پرائیویٹ جونیر ڈگری اور پالی ٹکنک کالجوں میں راست تقرر پر امتناع عائد ہے۔ سکریٹری انجمن خادم المسلمین اس سلسلے میں عدالت سے رجوع ہوئے اور ہائی کورٹ میں مقدمہ نمبر 6577/2013 انھوں نے دائر کیا۔ اس مقدمے کی سماعت کے بعد عدالت نے ہدایت دی کہ مذکورہ کالج میں منظورہ اسامیوں پر تقرر کیے جائیں۔ عدالت کے احکام کے مطابق کمشنر کالجیٹ ایجوکیشن حکومت تلنگانہ نے مذکورہ کالج کا گزشتہ ماہ دورہ کیا اور طلبہ کی تعداد اور لیکچررس کی درکار تعداد کا جائزہ لیتے ہوئے کالج کے لیے منظورہ عربی لیکچررس کی 3 اسامیوں میں سے تین پر تقرر کا فیصلہ کیا تاکہ عدالتی احکام کی پابندی ہو سکے۔ حکومت کی جانب سے اے کے ایم اورینٹل کالج کاچیگوڑہ میں عربی لیکچررس کی تین خالی اسامیوں پر تقرر کے احکام (اسپیشل کیس۔ کے طور پر) جاری کر دیے گئے نیز حکومت کے جی او نمبر 14 اعلا تعلیم کے رہنمایانہ ہدایات پر عمل آوری کی ہدایت دی گئی۔

(اعتماد۔ حیدرآباد)

مرارجی دیسائی رہائشی اقلیتی اسکولوں کو ریزرویشن سے مستثنیٰ قرار دیا جائے

بنگلور (۱۵ اکتوبر)۔ ملت ویلفیئر سوسائٹی داونگیرہ کے بانی اور ریاستی اقلیتی کمیشن کے سابق چیئرمین سیف اللہ نے آج ایک پریس کانفرنس کے دوران وزیر اعلا سدرامیا اور وزیر برائے اقلیتی امور جناب قمرالاسلام سے گزارش کی ہے کہ ریاست میں موجودہ 50 سے زائد اقلیتی رہائشی اسکولس جو مرارجی دیسائی رہائشی اسکولوں کے نام سے محکمۂ اقلیتی بہبود کے ماتحت جاری ہیں، ان اسکولوں میں 800 سے زائد تدریسی اور غیر تدریسی اسٹاف کے لیے کے پی ایس سی کے ذریعے تقرر کے لیے ماہ ستمبر میں نوٹیفکیشن جاری کیا گیا ہے، جس میں کئی عہدے ایس سی ایس ٹی کے لیے ریزرو رکھے گئے ہیں جب کہ یہ تمام اسکول رہائشی اردو اسکول کے طور پر چلائے جارہے ہیں۔ ۲۵ ستمبر کو کے پی ایس سی سے جاری اس نوٹیفکیشن کو منسوخ کرکے یہ تمام عہدے اقلیتی طبقے کے افراد کے لیے مختص کرنے دوبارہ نوٹیفکیشن جاری کیا جائے۔ اس مطالبے کو منوانے اور ان اسکولوں کے پس منظر اور اہمیت سے ذمہ داران حکومت کو آگاہ کرنے کے لیے وہ مختلف ملی اداروں اور پرائیویٹ اسکول مینجمنٹ کے ذمہ داروں کے ساتھ ریاستی وزیر قمرالاسلام، دیگر مسلم وزرا اور اراکین اسمبلی، کونسل سے ملاقات کریں گے اور وزیر اعلا کے پاس ایک وفد کی شکل میں ان ذمہ داروں کے ساتھ پہنچ کر درخواست کریں گے کہ مرارجی دیسائی رہائشی اسکولوں کے تمام عہدے اقلیتی طبقے کے امیدواروں کے لیے ہی مختص کیے جائیں اور سابقہ نوٹیفکیشن کو منسوخ کرکے نیا نوٹیفکیشن جاری کیا جائے۔ اقلیتی طبقے کے لیے پہلے پانچ رہائشی اسکول دیوے گوڑا جب ریاست کے وزیر اعلا تھے تو اس وقت منظور کیے گئے تھے جو ایک پرائیویٹ ٹرسٹ خواجہ غریب نواز ٹرسٹ کے ذریعے چلائے جارہے تھے۔ یہ پانچ رہائشی اسکول سری رنگاپٹن، رام نگرم، بیجاپور، گلبرگہ اور بنگلور میں مختلف اقلیتی ٹرسٹوں کو دیے گئے تھے۔ اس دور میں سیاسی اختلافات کے نتیجے میں چند لوگ عدالت گئے تو حکومت نے یہ اسکول پرائیویٹ ٹرسٹ سے واپس لے کر اپنی تحویل میں لے لیے۔ ۲۰۰۳ء میں جب کانگریس کے ایس ایم کرشنا کی حکومت تھی تو اس وقت کے وزیر مالیات شری سدرامیا سے درخواست کے بعد ان اسکولوں کو محکمۂ اقلیتی بہبود کی تحویل میں دیا گیا اور اعلان کیا گیا تھا کہ ہر ضلع میں ایسے اقلیتی رہائشی اسکول مرارجی اسکول کے نام سے قائم کیے جائیں گے، جس کے نتیجے میں آج ریاست میں پچاس سے زائد مرارجی دیسائی رہائشی اقلیتی اسکول چلائے جارہے ہیں۔ ان سارے اسکولوں میں اردو ذریعہ تعلیم ہے اور یہاں تعلیم پانے والے بچے بھی اقلیتی طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان اسکولوں کے عملے کے لیے ریزرویشن پالیسی شاید غلطی سے جاری ہوئی ہے کیوں کہ ان اسکولوں میں اردو جاننے والے عملے کی ضرورت ہے تاکہ یہاں کا نظام اور معیار تعلیم بہتر ہو۔ اس سلسلے میں حکومت کے ذمہ داروں سے ملاقات کرکے موجودہ نوٹیفکیشن کو منسوخ کرکے بغیر ریزرویشن کے نیا نوٹیفکیشن جاری کرنے کی درخواست کی جائے گی۔

(سالار۔ بنگلور)

اردو کے چھوٹے اخبارات کے مدیران کی وزیر اعلا چندرا بابو نائیڈو سے ملاقات

حیدرآباد (۱۹ اکتوبر)۔ اسمال اردو نیوز پیپر فیڈریشن آندھرا پردیش کا ایک وفد صدر فیڈریشن محمد نصیرالدین قادری کی قیادت میں آندھرا پردیش کے مدیران کے ساتھ چیف منسٹر چندرا بابو نائیڈو سے ان کی رہائش گاہ جوبلی ہلز میں ملاقات کی اور ایک یادداشت پیش کی۔ صدر فیڈریشن نے چندرا بابو کو بتایا کہ آندھرا پردیش میں کئی اردو کے چھوٹے اخبارات کی اشاعت عمل میں آتی ہے اس کے باوجود اردو اخبارات کو سرکاری اشتہارات اور مالی امداد فراہم نہیں کی جاتی ہے اور مدیران کے ساتھ ناانصافی کی جارہی ہے جب کہ تلگو دیشم کے دور اقتدار میں آنے پر اردو زبان اور چھوٹے اخبارات کے ساتھ انصاف کرنے اور ان کے مسائل کو حل کرنے کا وعدہ کیا گیا تھا۔ اس موقع پر محمد یوسف الدین قادری، محمد نثارالدین قادری، محمد غوث، محمد جہانگیر بابا اور دیا نند بھی موجود تھے۔

(رہنمائے دکن۔ حیدرآباد)

بودھن ڈویژن کے اردو میڈیم مدارس مسائل سے دوچار

خالی اسامیوں پر اساتذہ کا تقرر ناگزیر، ڈپٹی ڈی ای او سے نمائندگی

بودھن، تلنگانہ (۱۳ اکتوبر)۔ بودھن ڈویژن کے اردو میڈیم مدارس کا کوئی پرسان حال نہیں ہے۔ بعض مدارس میں طلبہ زیادہ ہیں تو اساتذہ کی کمی ہے اور جہاں طلبہ کی تعداد کم ہے وہاں تمام مضامین کے اساتذہ موجود ہیں۔ اردو مدارس میں اساتذہ و طلبہ کے اس عدم توازن کو ختم کرتے ہوئے حسب ضرورت اساتذہ کی خالی اسامیوں کو تبادلوں یا ڈیپوٹیشن کے ذریعے پُر کرنے کی خواہش کے ساتھ تلنگانہ اردو جرنلسٹ فورم بودھن کا ایک وفد ڈپٹی ڈی ای او بودھن جناب پدماہم سے ملاقات کرتے ہوئے انھیں شکرنگر بوائز ہائی اسکول اور بی ٹی نگر ہائی اسکول کے طلبہ و اساتذہ کی تعداد سے واقف کروایا جہاں شکرنگر ہائی اسکول اردو میڈیم میں تمام ۶ مضامین پڑھانے والے اساتذہ موجود ہیں لیکن یہاں طلبہ کی جملہ تعداد صرف ۳۸ ہے جب کہ اسی شہر بودھن میں واقع بی ٹی نگر ہائی اسکول اردو میڈیم میں صرف 305 طلبہ زیر تعلیم ہیں لیکن یہاں مستقل صرف دو اساتذہ ہیں۔ تلنگانہ جرنلسٹ فورم کے قائدین نے ڈپٹی ڈی ای او سے خواہش کی کہ شکرنگر میں موجود ایک زائد ریاضی کے مدرس کا تبادلہ بی ٹی نگر ہائی اسکول میں کیا جاسکتا ہے جہاں حساب کے ٹیچر کی کمی کی وجہ سے دسویں جماعت کے سالانہ امتحان کے نتائج پر بُرا اثر پڑ رہا ہے۔ ڈپٹی ڈی ای او نے بتایا کہ ریاستی حکومت نے جی او نمبر 6 جاری کرتے ہوئے محکمۂ تعلیمات کو ہدایت دی ہے کہ طلبہ و اساتذہ کی تعداد کے حساب سے از سر نو مدارس کا جائزہ لے کر اساتذہ کا تقرر عمل میں لایا جائے۔ انھوں نے بتایا کہ رکن اسمبلی بودھن شکیل عامر نے اپنے دورۂ شکرنگر ہائی اسکول کے دوران طلبہ و اساتذہ کی تعداد دریافت کرنے کے بعد انھوں نے شکرنگر گورنمنٹ ہائی اسکول میں موجود اساتذہ کی خدمات جہاں زائد طلبہ ہیں وہاں حاصل کرنے کی محکمۂ تعلیمات کے عہدیداروں سے خواہش کی تھی۔ اس ضمن میں ضلع انتظامیہ کو رپورٹ روانہ کی جاچکی ہے۔ صحافیوں کے اس وفد میں جناب محمد خورشید حسین اختر، ڈاکٹر محمد لطیف الدین قریشی، مرزا جلیل بیگ، عبداللہ قریشی کے علاوہ محمد عمر اور محمد کاظم بھی شامل تھے۔

(سیاست۔ حیدرآباد)

اردو کے نام پر قائم سٹی کالج میں اردو سے دشمنی کیوں؟

حیدرآباد۔ گورنمنٹ سٹی کالج حیدرآباد کا شمار صرف حیدرآباد ہی نہیں بلکہ ملک کے قدیم ترین تعلیمی اداروں میں ہوتا ہے۔ اس کالج سے کئی چیف منسٹرس، اہم سیاست داں، وائس چانسلر، ڈاکٹرس، انجینئرس، مشہور و معروف قانون داں، ماہر نامور ادیب، شاعر اور فنکاروں نے تعلیم حاصل کی۔ فن تعمیر کے لحاظ سے بھی ہمارے ملک کے کئی تعلیمی ادارے گورنمنٹ سٹی کالج کی خوب صورت عمارت کا مقابلہ نہیں کرسکتے۔ آصف سابع نواب میر عثمان علی خاں بہادر کے دور میں اس حسین عمارت کالج کی تعمیر عمل میں آئی تھی۔ ایک اردو اسکول سے ترقی کرتے ہوئے کالج میں تبدیل ہوچکا ہے جہاں انٹرمیڈیٹ سے لے کر پوسٹ گریجویٹ کی سطح تک تعلیم کا انتظام ہے، لیکن افسوس ہے کہ ایک اردو میڈیم اسکول کی حیثیت سے شروع ہوئے اس کالج میں اب اردو سے ہی دشمنی کی جانے لگی ہے۔ انٹرمیڈیٹ میں داخلہ لینے والے طلبہ کو زبان دوم کی حیثیت سے اردو اور عربی کے بجائے ہندی لینے پر مجبور کیا جارہا ہے۔ ان خیالات کا اظہار محب اردو جناب سید سمیع الدین نے کیا۔ اس ضمن میں طلبہ اور طالبات کے سرپرستوں نے کئی بار نمائندگی کی لیکن اس کا کوئی اثر نہیں ہوا جس کا ہمیں افسوس ہے۔ اس سلسلے میں ہم صحافتی برادری، اردو تنظیموں اور کالج کی انتظامیہ کے ذمہ داران سے بھی درخواست کرتے ہیں کہ وہ سنجیدگی سے نوٹ لیں اور فوری اس جانب توجہ دیں کہ طلبہ کو راحت ملے۔ مزید یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ کالج سے اردو میڈیم کافی عرصہ قبل برخاست ہوچکا ہے۔ یہاں صرف انگریزی اور تلگو میڈیم میں تعلیم دی جاتی ہے، حالاں کہ یہاں ۹۰ فیصد مسلمان طلبہ تعلیم حاصل کرتے ہیں، جو غریب اور متوسط خاندانوں سے تعلق رکھتے ہیں اور پرانے شہر کے قرب و جوار کے محلوں سے دور دور سے آتے ہیں تو پھر ہم جاننا چاہتے ہیں کہ اس تعلق سے شہر کی اردو تنظیمیں اور اردو اکیڈمی کیا کررہی ہے؟ اس کے علاوہ ڈگری کالج میں بھی طلبہ کے ساتھ امتیازی رویہ برتے جانے کی شکایت عام ہے۔ ہم ڈپٹی چیف منسٹر اور وزیر تعلیم سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ اس طرف فوری توجہ دیں۔ ٹی آر ایس کے دور حکومت میں اردو کے ساتھ ایسا سلوک نہیں ہونا چاہیے۔

(اعتماد۔ حیدرآباد)

اردو مدارس کی خالی اسامیوں پر تقرری کے لیے نمائندگی

محبوب نگر، تلنگانہ (۱۲ اکتوبر)۔ جوائنٹ کنوینر ریاستی لیگ مرزا قدوس بیگ نے آج دفتر ضلع کلکٹریٹ پر ضلع کلکٹر پریہ درشنی سے ملاقات کرکے ایک یادداشت حوالے کی جس میں کہا گیا ہے کہ تعلیمی سال 2014-15 کے لیے ضلع کے اردو مدارس میں خالی اسامیوں پر اردو اکیڈمک انسٹرکٹرس کی نصف تعلیمی سال ختم ہونے کے باوجود تقرری نہیں کی جارہی ہے جس کی وجہ سے طلبہ کا مستقبل تاریک ہورہا ہے۔ اس یادداشت میں مطالبہ کیا گیا کہ فی الفور بھرتی عمل میں لائی جائے اور مزید خالی اسامیوں کی نشاندہی کرتے ہوئے ان کو بھی پُر کیا جائے۔ محبوب نگر کے ۶۴ منڈلوں میں ابھی تک صرف ۹۵ اسامیوں کی نشاندہی کی گئی ہے جو کہ ناکافی ہے۔ ضلع کلکٹر سے گزارش ہے کہ وہ اردو میڈیم مدارس میں بنیادی سہولیات کو فراہم کرنے کے لیے اقدام کریں۔

(رہنمائے دکن۔ حیدرآباد)

اردو میڈیم مدارس کے مسائل حل کیے جائیں

محبوب نگر، تلنگانہ (۱۳ اکتوبر)۔ تلنگانہ ریاست کے اردو میڈیم مدارس کے مسائل کے حل کے لیے اساتذہ ایم ایل سی پی سدھاکر ریڈی اور پی آر ٹی یو کے ریاستی صدر ہرشوردھن ریڈی نے نائب وزیر اعلا جناب محمد محمود علی سے ملاقات کی اور اردو میڈیم مدارس کے مسائل کو لے کر تفصیلی یادداشت پیش کرتے ہوئے مطالبہ کیا کہ ریاست تلنگانہ میں اردو زبان کی کافی مقبولیت ہے خاص طور سے ضلع محبوب نگر کے اردو میڈیم مدارس بہت اہمیت کے حامل ہیں جب کہ حالت یہ ہے کہ ضلع محبوب نگر کے چند اردو میڈیم سرکاری مدارس کو اساتذہ کے نہ ہونے اور دیگر مسائل کی بنا پر بند کرنا پڑ رہا ہے۔ یادداشت میں مزید کہا گیا ہے کہ ریاست تلنگانہ کے کئی اردو میڈیم مدارس میں طلبہ کی تعداد زیادہ ہے لیکن اساتذہ کی مطلوبہ تعداد نہ ہونے سے اردو میڈیم مدارس کے طلبہ کی تعلیم متاثر ہورہی ہے اور بہت سے طلبہ ترک تعلیم پر مجبور ہیں۔ انھوں نے مطالبہ کیا کہ اردو میڈیم مدارس میں گزیٹڈ ہیڈ ماسٹرز کو متعین کیا جائے اور ریاست تلنگانہ کے تمام مدارس میں خالی اسامیوں کو پُر کیا جائے، بالخصوص اردو میڈیم ڈی ایس سی منعقد کرکے اردو میڈیم سرکاری مدارس میں اساتذہ کی فی الفور تقرری کی جائے۔

(اعتماد۔ حیدرآباد)

آندھراپردیش کے اردو اخبارات و رسائل کی ترقی کے لیے حکومت کا تعاون ضروری

کرنول، آندھراپردیش (۱۸ اکتوبر)۔ کرنول سے شائع ہونے والے اردو ماہنامہ 'بزم آئینہ' کی رسم اجرا سابق رکن اسمبلی کرنول جناب ایم اے غفور کے ہاتھوں دفتر سی پی ایم پارٹی میں عمل میں آیا۔ رسم اجرا کے بعد جناب ایم اے غفور نے کہا کہ میں اس موقعے پر ریاستی اور مرکزی حکومتوں سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ اردو اخبارات کے لیے اپنا مکمل تعاون دیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ اردو زبان کی ترقی کے لیے مرکزی حکومت اور ریاستی حکومت کو چاہیے کہ وہ زیادہ سے زیادہ فنڈ مختص کریں۔ ایم اے غفور نے بتایا کہ اگر کسی بھی اردو رسالے کو آگے بڑھنا ہے تو حکومت کا تعاون ضروری ہے۔

(رہنمائے دکن۔ حیدرآباد)

رخصید ولے نہ از دل ما

بلند شہر۔ اردو کے مشہور و ممتاز صحافی جناب اطہر علی عباسی کا ۱۹ اکتوبر ۲۰۱۴ء کو طویل علالت کے بعد انتقال ہوگیا۔ ان کی عمر ۶۷ برس تھی۔ مرحوم کے پس ماندگان میں بیوہ کے علاوہ پانچ بیٹے اور تین بیٹیاں ہیں۔ ان کی تدفین بعد نماز ظہر کالا آم چوراہے کربلا قبرستان میں عمل میں آئی۔ اطہر علی عباسی ۱۹۵۴ء سے صحافت سے وابستہ تھے۔ وہ دہلی سے شائع ہونے والے اخبارات 'الجمعیۃ' اور 'دعوت' کے بلند شہر میں نامہ نگار تھے۔ فی الوقت وہ اردو روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' سے منسلک تھے۔ اطہر علی عباسی اس دو رکنی کمیٹی کے ممبر بھی تھے جس کی تشکیل یوپی حکومت نے سال ۲۰۱۴ء کے اسمبلی انتخابات کے دوران پیڈ نیوز کے معاملوں کی نگرانی کرنے کے لیے کی تھی۔ تقریباً ۶۰ برس کی اپنی صحافتی زندگی میں اطہر علی عباسی نے نمایاں رول ادا کیا تھا اور ان کا شمار مغربی یوپی کے ممتاز صحافیوں میں کیا جاتا تھا۔ ان کے جنازے میں علاقے کے معزز شخصیات نے شرکت کی۔

ادارہ 'ہماری زبان' مرحوم کے لیے مغفرت اور پس ماندگان کے لیے صبر جمیل کی دعا کرتا ہے۔ (ادارہ)

نظام آباد میں اردو پڑھنے کے لیے صرف اردو داں افراد کے تقرر کا مطالبہ

نظام آباد، تلنگانہ۔ آل انڈیا آئیڈیل ٹیچرس ایسوسی ایشن نظام آباد یونٹ کے صدر جناب محمد اسحاق حسین نے اپنے ایک صحافتی بیان میں اردو میڈیم ہائی اسکولوں میں مضمون انگریزی پڑھانے کے لیے صرف اور صرف اردو داں اساتذہ کے تقرر کا مطالبہ کیا۔ انھوں نے کہا کہ اردو میڈیم ہائی اسکولوں میں مضمون انگریزی پڑھانے کے لیے تلگو داں اساتذہ کے تقرر کرنے سے جس سے اردو میڈیم کے طلبہ کو دشواری پیش آرہی ہے کیوں کہ تلگو داں اساتذہ انگریزی مضمون کو تلگو میں سمجھا رہے ہیں۔ اردو میڈیم ہائی اسکولوں میں تلگو داں اساتذہ کو ترقی دے کر مضمون انگریزی پڑھانے کے لیے مقرر کیا گیا جس سے اردو داں اساتذہ ترقی سے محروم ہوگئے۔ انھوں نے مطالبہ کیا کہ اردو میڈیم ہائی اسکولوں میں مضمون انگریزی پڑھانے کے لیے صرف اور صرف اردو داں اساتذہ کا تقرر کیا جائے تاکہ اردو میڈیم طلبہ کے ساتھ انصاف ہوسکے۔ اردو میڈیم ہائی اسکولوں میں مضمون انگریزی پڑھانے کے لیے تلگو داں اساتذہ کا تقرر اردو میڈیم کے طلبہ کے ساتھ سراسر ناانصافی ہے اور اردو داں اساتذہ کو ترقی سے محروم کررہا ہے۔ انھوں نے ڈائرکٹر آف اسکول ایجوکیشن، ڈپٹی چیف منسٹر محمود علی، چیف منسٹر تلنگانہ کے سی آر اور نظام آباد کی رکن پارلیمنٹ کے کویتا سے پرزور مطالبہ کیا کہ وہ اردو میڈیم کے طلبہ اور اردو میڈیم کے اساتذہ کے ساتھ انصاف کریں۔ اردو میڈیم ہائی اسکولوں میں مضمون انگریزی پڑھانے کے لیے اردو داں اساتذہ کا تقرر کیا جائے اور تلگو میڈیم ہائی اسکولوں میں مضمون انگریزی پڑھانے کے لیے تلگو داں اساتذہ کا تقرر کیا جائے۔ اردو میڈیم ہائی اسکولوں میں مضمون انگریزی پڑھانے کے لیے صرف اردو داں اساتذہ کو ترقی دی جائے اور تلگو میڈیم ہائی اسکولوں میں مضمون انگریزی پڑھانے کے لیے تلگو داں اساتذہ کو ترقی دی جائے۔

(رہنمائے دکن۔ حیدرآباد)

نئی کتابیں

تبصرے کے لیے دو کتابوں کا آنا ضروری ہے

نام کتاب : **بساطِ سخن**
(مجموعۂ رباعیات)
مصنف : عبدالمتین جامی
ضخامت : ۱۲۸ صفحات
قیمت : ۱۲۵ روپے
ناشر : ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس لال کنواں، دہلی-۶
تبصرہ نگار : امیر حمزہ
ameerhamzah033@gmai.com

عبدالمتین جامی صاحب صوبہ اڑیسہ کے ایک کہنہ مشق استاد شاعر ہیں۔ اڑیسہ میں کٹک ہی ایک ایسا علاقہ ہے جہاں اردو زبان و ادب کی سانسیں بدستور چل رہی ہیں، جہاں سے کئی اردو رسائل شائع ہوتے ہیں۔ اسی سرزمین نے بہت سارے شاعروں کو جنم دیا۔ ہر شہر میں آپ کو شاعروں کی ایک اچھی خاصی تعداد مل سکتی ہے لیکن رباعی گو شاعر کو اگر آپ ہر شہر میں تلاش کریں گے تو آپ کو مایوسی ہاتھ آئے گی۔ رباعی ایک ایسی صنف سخن ہے جس کی جانب عموماً توجہ نہیں دی جاتی ہے بہت ہی کم شاعر توجہ دیتے ہیں۔ بقول جوش: اکثر پچاس بہاریں گزارنے کے بعد ہی اس کو اپنے قابو میں لانے کی کوشش کرتا ہے۔

آزادی کے بعد اگرچہ رباعی گو شعرا کی تعداد میں کافی اضافہ ہوا ہے لیکن جب ہم اردو تاریخ پر نظر ڈالتے ہیں تو شروع میں کچھ بچے شاعر ہی نظر آتے ہیں۔ انیس و دبیر تک آتے آتے اردو میں رباعی ایک مضبوط صنف سخن کے طور پر ابھر کر آتی ہے اور جہاں تک بیسویں صدی میں رباعی کی جانب توجہ مبذول ہوئی تو وہ فٹز جیرالڈ کے تراجم، رباعیات خیام اور دنیا بھر میں عمر خیام کی مقبولیت کا نتیجہ ہے۔ اسی وجہ سے بیسویں صدی میں اردو رباعی گو شاعروں کی اچھی خاصی تعداد نظر آتی ہے۔ آزادی کے بعد رباعیوں کے جانب خاطر خواہ توجہ دی گئی جس میں ایک اہم نام عبدالمتین جامی صاحب کا بھی ہے۔

اس سے قبل مصنف کا ایک غزلوں کا مجموعہ 'نشاط آگہی' کے نام سے شائع ہوکر مقبول ہو چکا ہے۔ 'آبنائے تصور' کے نام سے ان کا دیوان طباعت کے مراحل میں ہے۔ زیر تبصرہ ان کی رباعیات کا مجموعہ ہے جس میں تین سو سے زیادہ رباعیوں کو شامل کیا گیا ہے، اگرچہ انھوں نے ہزار کے قریب رباعیاں کہی ہیں۔ ان کی رباعیاں ملک کے کئی موقر جریدوں میں شائع بھی ہوئے ہیں۔

آج کل اردو میں بہت ساری ایسی رباعیاں کہی جا رہی ہیں، جن کی طرف آپ اگر باریک بینی کے ساتھ توجہ کریں تو احساس ہوگا کہ یہ رباعیاں کم بلکہ رباعی کے اوزان میں کہے گئے غزلیہ اشعار ہیں۔ عبدالمتین جامی اس سے مستثنیٰ ہیں جنھوں نے رباعیاں رباعی کے مروجہ ۲۴ اوزان میں کہی ہیں اور ان کو بہت ہی اچھے انداز میں برتا ہے۔ شاعر نے زیر تبصرہ کتاب میں تقریباً تمام قسم کی رباعیاں کہی ہیں حمدیہ، نعتیہ، مذہبی، عصری، سیاسی اور عشقیہ ہر قسم کی رباعی کو انھوں نے اس میں شامل کیا ہے:

تعریف خدایا تیری کیسے ہو بیاں
جلوہ تیرا ہر شے میں ہے ہر سمت عیاں
سب مانگ رہے ہیں تیری رحمت کی بھیک
کرتے ہیں طلب بھی تجھ سے امن و اماں

جامی صاحب نے اپنے مخصوص خیالات کو رباعی کے قالب میں بہت ہی آسانی کے ساتھ ڈھالا ہے:

ایک موج کا دریا ہے بڑھے آگے رواں
معلوم نہیں یہ جا کے رکتا ہے کہاں
رفتار میں تو برق سے بھی تیز ہے یہ
شاید ہی اسے روک سکے کون و مکاں

ان کی رباعیوں میں زندگی کا ہر رنگ جھلکتا ہے۔ رباعی میں غزل کی طرح ہر قسم کے افکار و خیالات کو پیش کر سکتے ہیں اور اگر اس فکر اور خیال میں حکمت کی آمیزش ہو جائے تو رباعی میں جان آ جاتی ہے ورنہ وہ دو مصرع کی غزل ہو کر رہ جاتی ہے۔ جامی صاحب کی ایک رباعی ملاحظہ ہو:

ہے گل کا مجسم تبسم عورت
فطرت کا ہے انداز تکلم عورت
کرتی ہے زمانہ کو اسیر نغمہ
ہے ساز محبت کا ترنم عورت

امید ہے کہ مصنف کا یہ مجموعہ بھی اردو رباعیوں میں ایک اہم اضافہ ثابت ہوگا۔

●●●

بقیہ: شبلی نعمانی

صفحہ ۲ سے آگے

محبت کا مولانا شبلی پر کوئی اثر نہ ہوتا غیر ممکن تھا۔ مگر اہل حدیث کی طرف سے ان کے دل میں جو بغض تھی وہ بھی ممکن نہ تھا کہ انھیں نعمانیت اور حنفیت کے دائرے سے باہر نکلنے دیتی۔

لہٰذا آخر اس کے کہ غیر مقلدی کا کچھ بھی رنگ چڑھنے پائے وہ بلاواسطہ نعمانی سے معتزلی بننے لگے اور آخر میں اس بات کی کوشش شروع کی کہ خود حنفیت کو اصلی اعتزال ثابت کریں اور بخلاف متاخرین حنفیہ کے جو حنفیت کو اشعریت کی طرف کھینچنا چاہتے ہیں انھوں نے اپنی حنفیت کو اشعریت کا سخت دشمن اور فقہ کے پردے میں چھپی ہوئی معتزلیت ثابت کرنا چاہا جس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ انگریزی کے طلبہ تو ان کی باتوں سے خوش ہو ہوکے دینداری و خوش اعتقادی کے جوش میں معتزلی ہونے لگے اور موجودہ علمائے حنفیہ کو ان سے سخت عناد ہو گیا۔

اب اس کے ساتھ ہی ان میں ایک دوسرا تغیر شروع ہوا، ان کی طبیعت میں باوجود انتہا درجے کے اخلاق کے، خودداری کا خیال بہت بڑھا ہوا تھا۔ سید صاحب کی صحبت، علی گڑھ کالج کی سرپرستی اور ان کی ذاتی قابلیت نے انھیں ابتداءً اس حیثیت سے پبلک میں انٹروڈیوس کرایا کہ سید صاحب کے گروہ کے ایک نامور بزرگ اور ان کی فوج کے ایک نامی پہلوان ہیں، خصوصاً جب وہ سید صاحب کے ہمرکاب حیدرآباد گئے تو مسلمانوں میں اس خیال کو اور بھی تقویت حاصل ہوگئی۔ مگر خود مولانا شبلی کی خودداری اس حیثیت کو اپنی شان سے بہت کم بلکہ اپنی ذلت اور سبکی تصور کرتی تھی۔ اپنی ان تصنیفوں اور نظموں کو تو وہ چھانٹ سکتے تھے جن میں خود ہی اپنی اس حیثیت کو آشکارا کر چکے تھے۔ لیکن اب اس بات کو ناقابل برداشت دیکھ کے علی گڑھ کالج سے علاحدگی اختیار کرکے ندوۃ العلماء میں شرکت کی اور سمجھے کہ اس ذریعے سے میں علما کا سرتاج اور شیخ الکل بن کے اس درجے پر پہنچ جاؤں گا جو سید صاحب کے درجے سے بھی مافوق ہے۔ میں نے ان کو بارہا اس خیال سے روکا اور اسی زمانے میں کہہ دیا تھا کہ علما بس میں آنے والے نہیں ہیں۔ ان مرحومین امت میں سے ہر ایک پریسیڈنٹ کی حیثیت رکھتا ہے اور جس جماعت میں فقط پریسیڈنٹ ہی پریسیڈنٹ ہوں اس پر آیہ کریمہ لو کان فیہما آلھۃ الا اللہ لفسدتا پوری پوری صادق آتی ہے۔ ان کے بہت سے دوستوں نے بھی روکا اور کہا کہ آپ کی ترقی کا میدان علی گڑھ ہی میں ہے، مگر انھوں نے نہ مانا اور نتیجہ یہ ہوا کہ انھوں نے ندوہ کو بے حد فائدہ پہنچایا اور ندوہ کو ندوہ بنا دیا، مگر آخر میں ندوہ والے مرحومین امت ہی کے ہاتھ مارے گئے جس کا ان کے دوستوں کو بے حد ملال ہوا اور خود وہ بھی اپنی اس محنت کے اکارت جانے پر کف افسوس ملتے ہوئے مرے۔

دوسری طرف علی گڑھ پارٹی سے علاحدہ ہونے کا نتیجہ یہ ہوا کہ نئے تعلیم یافتہ گروہ میں سے بہت سے قابل لوگ ان کے خلاف ہو گئے جو ظاہر میں تو ان سے موافق تھے مگر موقع پاتے ہی ان پر اعتراض کر جاتے۔ ادھر مولانا کے دل میں کچھ ایسی ضد پیدا ہوگئی کہ سید صاحب کا جو درجہ ان کے قدر شناسوں کے دل میں تھا، اس سے انھیں گرانا چاہتے اور بعض صحبتوں میں ایسی باتیں کہہ جاتے جو لوگوں کو بہت زیادہ ناگوار گزرتیں۔ ندوہ کا انتظام ہاتھ میں لینے کے زمانے میں ان کی یہ حالت تھی کہ کالج میں اور مسلمانوں کے ساتھ سید صاحب کا جو طرز عمل دیکھ چکے تھے اسی کو اپنا دستور العمل قرار دے لیا تھا اور ساتھ ہی سید صاحب سے اپنی علاحدگی اور برأت ثابت کرنے کی کوشش کرتے، مگر دراصل یہ وہ باتیں تھیں جو ان سے بھی نباہے نہ نبھیں۔ اسی دوران انھوں نے اور کئی کتابیں لکھیں، ان کی سب سے زیادہ مقبول کتاب 'سیرت الفاروق' (صحیح نام الفاروق) علی گڑھ میں شائع ہو چکی تھی۔ 'علم الکلام'، 'الکلام'، 'سوانح مولانا روم' وہ کتابیں ہیں جو مسلمانوں کے سامنے اعتزال کو نعمانیت کا لباس پہنا کے پیش کرتی ہیں۔

شاعرانہ مذاق میں تاریخی جستجو کے امتزاج نے ان سے 'موازنۂ دبیر و انیس' اور 'شعر العجم' کو تصنیف کرایا، مگر سب سے اہم تصنیف 'سیرۃ رسول صلی اللہ علیہ وسلم' (موسوم بہ 'سیرۃ النبی') ہے جس کو ناتمام چھوڑ کے دنیا سے گئے ہیں۔ ان کی وصیت کے مطابق مولانا حمیدالدین صاحب اور مولوی سلیمان صاحب ندوی نے اس کام کو اپنے ہاتھ میں لیا ہے اور علیا حضرت بیگم صاحب بھوپال نے آخر تک سرپرستی کرنے کا وعدہ فرمایا ہے۔ کوشش ہو رہی ہے کہ یہ کام بہت جلد پورا ہو اور ہمیں امید ہے کہ یہ مولانا کی اعلیٰ ترین اور مفید ترین تصنیف ثابت ہوگی۔

مولانا کا اہم کام رسالہ 'الندوہ' تھا جس نے مسلمانوں کے لیے بہت سا محققانہ تاریخی سامان فراہم کر دیا اور اس کے سلسلے میں مولانا نے بڑے بڑے اہم مسائل میں تحقیق و تدقیق سے کام لیا ہے۔ قیام قسطنطنیہ کے زمانے میں انھیں عثمان پاشا مرحوم کی سفارش سے سلطان المعظم نے تمغۂ مجیدیہ عطا کیا اور گورنمنٹ سے ان کو شمس العلما کا خطاب عطا ہوا۔ یہ چیزیں خان بہادروں کے نزدیک چاہے کیسی ہی اہمیت رکھتی ہوں ہمارے نزدیک چنداں قابل لحاظ نہیں۔

(بہ شکریہ ماہنامہ 'امنگ' نومبر ۲۰۱۲ء)

بقیہ: جواہر لال نہرو اور مولانا آزاد...

صفحہ ۳ سے آگے

کتابوں میں میرامن کی 'باغ و بہار' اور مولانا محمد حسین آزاد کی 'دربار اکبری' کے نام بھی سامنے آتے ہیں۔ آزادی کے بعد جب ایک بار مصر کے صدر جمال عبدالناصر ہندوستان کے دورے پر آئے تھے تو ان کے اعزاز میں دی گئی ایک پارٹی میں انھیں یہ جان کر دل خوش کن حیرت ہوئی کہ پنڈت جی کے نام کے تینوں لفظ 'جواہر'، 'لعل' اور 'نہرو' عربی کے ہیں اور وہ یہی املا لکھتے ہیں۔

بہرحال مذہب کی بنیاد پر تقسیم کی خونی لکیر نے اردو اور ہندی کے درمیان خلیج گہری کر دی۔ اردو پاکستان کی سرکاری زبان قرار دی گئی، اس باعث بھی ہند میں اردو کے ساتھ ہر طرح کی بے انصافی برتی گئی اور سرکاری سرپرستی میں ہندی نے ملک گیر زبان کی حیثیت اختیار کر لی۔ اگرچہ گاندھی، نہرو اور آزاد نے بھی چاہا کہ آزاد ہندوستان کی ملکی زبان 'ہندستانی' ہو جو دیوناگری اور نستعلیق دونوں رسوم خط میں چلن میں رہے لیکن فرقہ پرست حکام نے یہ بیل منڈھے نہ چڑھنے دی۔

پنڈت نہرو تقسیم سے متاثر ذہنوں کو اپنے ان خیالات کا قائل نہ کرا پائے کہ اردو اس ملک کی ایک اہم، مقبول

اور کروڑوں لوگوں کی مادری زبان ہے جو اس ملک کے ایک عظیم مذہب اسلام کے مذہبی اور تہذیبی ورثے کو سمجھنے میں مددگار ہے اور یہ زبان نہ صرف ہمارے پڑوسی ملک سے تعلقات میں معاون ثابت ہوگی بلکہ اس کا رسم خط ایران، افغانستان اور عرب دنیا کے ملکوں سے بھی ہمارے رشتوں کو مضبوط کرے گا۔'

انھوں نے ہندی اور اردو کے لغوی تنازعوں پر بھی ہمدردی کے ساتھ مدبرانہ غور کیا تھا۔ انھوں نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ 'اردو اور ہندی دونوں زبانوں کا سکون وجمود کے ایک طویل عرصے سے بیدار ہوکر جدید تصورات سے سامنا ہوا ہے اور وہ اپنی کم مائگی کے باعث اظہار مطالب کے لیے سنسکرت اور فارسی کے منبع سے کسب فیض کرنے پر مجبور ہیں۔ اسے تو سمجھا جاسکتا ہے لیکن اگر ہندی اور اردو کی انجمنیں اپنی اپنی زبانوں کی پاکیزگی اور شدھی کے خیال سے اس رجحان کو ناپسندیدہ انتہا تک لے جاتی ہیں تو اسے گوارا نہیں کیا جاسکتا۔' مثلاً اس موقع پر سنسکرت کے ایک پنڈت کو دیا ہوا اُن کا جواب دہرانے کو جی چاہتا ہے۔ ہوا یوں کہ ایک بار ریڈیو آرٹسٹوں اور براڈکاسٹروں کی ایک غیر رسمی میٹنگ میں اُن پنڈت مہاشے نے نہرو جی کو مشورہ دیا کہ ہندی خبروں میں سنسکرت لفظوں کا تناسب بڑھا دینا چاہیے تاکہ جنوبی ہند والے بھی اسے سمجھ سکیں۔ نہرو نے انھیں جواب دیا تھا کہ ایسی ہندی جنوبی ہند والے سمجھ سکیں گے یا نہیں، پتا نہیں! لیکن شمالی ہند والے اسے یقیناً نہیں سمجھ پائیں گے۔'

انھوں نے اردو اور ہندی کے متوالوں کو یہ مشورہ بھی دیا تھا کہ 'وہ ایک دوسرے کی لفظیات سے محض اس لیے نفرت نہ کریں کہ وہ اُن کے مخصوص پس منظر میں نہیں پنپتے اس کی بجائے دونوں زبانوں کو نہ صرف ایک دوسرے کے تصورات اور لفظوں کے لیے اپنے دروازے اور دریچے کھلے رکھنے چاہئیں بلکہ غیر زبانوں کے الفاظ وخیالات کو بھی خوش آمدید کہنا چاہیے۔ (باقی آئندہ)

بقیہ: شبلی اور انجمن ترقی اردو (ہند)

صفحہ 8 سے آگے

نئی انجمن تھی، شبلی کے سامنے سب سے بڑی مشکل سرمایہ کی تھی۔ شبلی نے علی گڑھ سے رابطہ قائم کیا اور علی گڑھ کالج کی ڈیوٹی شاپ سے مدد لی گئی۔ بقول ایم حبیب خاں:

"اس وقت ڈیوٹی شاپ کے منیجر میر ولایت حسین تھے۔ میر صاحب نے نصف منافع پر انجمن کے ساتھ تعاون کیا اور اپریل ۱۹۰۳ء سے انجمن کی کتابیں شائع ہونے لگیں۔"
(شبلی کی علمی وادبی خدمات ص306)

کچھ آمدنی بڑھی تو شبلی کا تاریخی اور علمی ذہن ایسی کتابوں کے شائع کرنے کے بارے میں سوچنے لگا جن کا تعلق فلسفہ اور سائنس سے تھا۔ اس لیے کہ اس وقت تک اردو زبان میں ان موضوعات پر کتابیں نہ کے برابر تھیں۔ شبلی کا خیال تھا کہ ان موضوعات پر آسان اور سہل کتابیں شائع کی جائیں تاکہ اردو کا معاشرہ متعارف ہو سکے۔ لیکن افسوس جیسے مترجم شبلی چاہتے تھے وہ انھیں نہ مل سکے۔ چنانچہ 13 اگست 1903 کو مولانا شبلی محسن الملک کو خط میں لکھتے ہیں:

"یہ مہینہ مشہورہ کتابوں کے ترجمے کے امتحان کا مہینہ تھا۔ جو کچھ ظہور میں آیا اس سے قومی مسائل کے متعلق مہتم بالشان نتیجہ حاصل ہوئے ہیں۔ جس سے انجمن کی تجاویز ملک میں شائع ہوئی تھیں تو اطراف ہند سے اس قدر درخواستیں آئی تھیں کہ گمان ہوتا تھا کہ ہندستان عباسیوں کا بغداد بن گیا ہے لیکن جب مقررہ کتابوں کا اشتہار چھپا تو ہر طرف سناٹا تھا۔ کتاب النباتات اور طبقات الارض کو کسی نے ہاتھ نہیں لگایا۔"
(بحوالہ حیات شبلی ص324)

انجمن کا پہلا سال شبلی کی غیر معمولی کوششوں کے ذریعے کامیاب رہا۔ دسمبر 1903 میں بمبئی میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس ہوا تو شبلی نے تفصیلی رپورٹ پیش کی، جو بقول سلیمان ندوی "یہ رپورٹ بڑی دلچسپ اور پڑھنے لائق ہے۔" درمیان میں ایک مختصر رپورٹ شبلی نے محسن الملک کو بھیجی تھی۔ اس کا ایک اقتباس ایک مضمون میں یوں ملتا ہے:

"کار جنوری ۱۹۰۳ء سے اپریل ۱۹۰۴ء تک میں نے 119 خطوط مختلف مقامات میں لکھے۔ ان خطوط میں مجھے یہ دریافت کرنا مقصود تھا کہ ترقی اردو کو اہل ملک کس نظر سے دیکھیں گے۔ میں نہایت خوشی سے اطلاع دیتا ہوں کہ عوام و خواص کو اس شعبے سے اس قدر ہمدردی ہے کہ شاید کسی اور شعبے سے اس قدر ہوگی۔ بعض احباب اس شعبے سے عملی طور پر ہونے کے لیے از حد مضطر ہیں۔"
(شبلی کی علمی وادبی خدمات ص376)

شبلی کی سکریٹری شپ میں انجمن کامیابی کے ساتھ ایک سال گزارنے کے بعد دوسرے سال (1904) میں داخل ہوئی۔ ممبران میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ کچھ سرمایہ بھی اکٹھا ہوا۔ تعلیمی نصاب پر زیادہ توجہ دی گئی اور دوسرے سال درج ذیل کتابوں کی اشاعت منظور ہوئی:

۱- ترجمہ ایجوکیشن ہربرٹ اسپنسر
۲- ترجمہ میکس مولر لیکچرز
۳- الفخر
۴- تاریخ تمدن
۵- سوانح عمری حضرت امیر خسرو دہلوی
۶- قدیم فارسی
۷- سوانح عمری حضرت میر انیس
۸- طریقہ حکومت انگریزی

ان کتابوں کے عنوانات ملاحظہ کیجیے ان میں زیادہ تر شبلی کی فکر وعمل کا نتیجہ تھے جو بعد میں خود شبلی نے انجام دیے۔ موازنہ انیس ودبیر اس کا بہترین نتیجہ ہے۔ شاید خسرو پر بھی وہ لکھتے لیکن غیر معمولی مصروفیات، ندوہ سے تعلقات اور مختصر حیات کی وجہ سے ان کے بہت سے کام ادھورے چھوٹ گئے۔

انجمن ترقی اردو کے حوالے سے شبلی کی خط وکتابت، اشاعت جاری رہی۔ رائے مشورے ہوتے رہے۔ مولانا حمید الدین جو ان کے رشتے کے بھائی تھے اور مدرسۃ الاسلام کراچی کے سرپرست بھی۔ ایک خط میں ان سے دریافت کرتے ہیں "اردو نے اب تک جو کام کیا ہے وہ علی گڑھ گزٹ میں اس ہفتہ شائع ہوگا اس کو دیکھنا تم بتاؤ کہ عربی زبان سے کون سی کتابیں ترجمہ کے قابل ہیں۔" (17 جون 1903)

ایک خط میں مہدی افادی کو لکھتے ہیں:

"اردو ادب کے ساتھ آپ کا جو عشق ہے اب اس کے اظہار کا موقع ہے۔ دستور العمل ارسال ہے، جو کچھ ہو سکے بھیجیے۔"
(11 مئی 1903)

اس طرح بہار کے مولوی ریاض الحسن خاں خیال کو لکھا کہ وہ فارسی کتب "ہمہ دانشوران" کا ترجمہ کریں۔ اسی طرح وہ اپنے ایک اور دوست محمد سمیع کو بھی انجمن کے تعلق سے لکھتے ہیں اور شعرائے اردو کے تذکرے کے بارے میں بھی احباب سے صلاح مشورے کرتے ہیں۔

مولانا نے ایک اور اہم کام کرنا چاہا کہ اس وقت تک ان موضوعات پر اردو میں جتنی بھی کتابیں شائع ہو چکی ہیں ان کی ایک مفصل فہرست شائع ہو۔ اس کے لیے انھوں نے پروفیسر محمد سجاد مرزا کو منتخب کیا جو ان دنوں حیدرآباد میں ہی تھے۔ اور بقول سلیمان ندوی انھوں نے یہ کام شروع تو کر دیا لیکن ختم کیا 1922 میں یہ کتاب 'المطبوعات' کے عنوان سے شائع ہوئی۔ (حیات شبلی ص 325) کام اور بھی ہوتے لیکن مولانا کے ساتھ عملی دقت یہ تھی کہ وہ ان دنوں حیدرآباد میں تھے اور اپنی گراں بہا تصنیفات میں مصروف تھے۔ 13 جولائی 1904 کے ایک خط میں لکھتے ہیں:

"میں اردو کے قصد میں بہت عدیم الفرصت ہو گیا ہوں۔ جو وقت بچتا ہے خط وکتابت میں صرف ہو جاتا ہے۔"

اس دور میں شبلی نے غیر معمولی علمی کارنامے انجام دیے۔ الغزالی، الکلام، سوانح مولانا روم اور موازنہ انیس ودبیر جیسی معرکے کی کتابیں لکھیں۔ نیز ندوہ کے رسالہ الندوہ کا خاکہ تیار کیا اور بعد کو اس کے ایڈیٹر بھی ہوئے۔ دہلی میں 'اسلام کی بے تعصبی' کے موضوع پر لیکچر دیا (1904) بھوپال آتے جاتے رہے۔ اس درمیان کچھ ذاتی نوعیت کے حادثے ہوئے۔ دوسری صاحبزادی رابعہ نے کم عمری میں وفات پائی۔ کم سن بیٹے نے بھی انتقال کیا۔ قرض ادا کرتے رہے غرض کہ مصروفیات اور پریشانیوں کی وجہ سے صحت خراب رہنے لگی اور وہ حیدرآباد سے مستقل ہو کر ندوہ میں آ کر جم گئے۔ ندوہ سے پرانا عشق جاگ اٹھا اور وہ نہ صرف رسالہ بلکہ نصاب کا خاکہ وغیرہ بنانے میں اس قدر غرق ہوئے کہ بالآخر انجمن ترقی اردو کی سکریٹری شپ سے بھی استعفیٰ دے دیا۔ بیگم بھوپال نے بھوپال آنے دعوت دی۔ انجمن کے دیگر ارکان اور سرپرستان انھیں انجمن سے وابستہ رہنے کو کہتے رہے لیکن شبلی پر ندوہ سوار تھا اور وہ 1905 میں باقاعدہ ندوہ کی ذمہ داری سنبھال لی اس وابستگی سے اہل ندوہ بے حد خوش ہوئے۔ سلیمان ندوی لکھتے ہیں:

"مولانا کی تشریف آوری اور قیام کی خبر جب دارالعلوم کے طلبہ کو ملی تو ان کو بے حد خوشی ہوئی اور اس خوشی کا اظہار مختلف طریقوں سے کیا گیا۔ طلبہ نے جلسے کیے تقریریں کیں، نظمیں لکھی گئیں، خاکسار نے بھی طلبہ کی ایک انجمن میں اپنی خوشی و مسرت کا اظہار ایک فارسی قصیدہ میں کیا جو زندگی میں فارسی کا پہلا کلام ہے اور آخری بھی۔"
(حیات شبلی ص326)

ندوہ میں تو خوشی تھی لیکن انجمن ترقی اردو کے لیے یہ حادثہ تھا۔ ہر چند کہ اس کے بعد حبیب الرحمن شروانی، قاضی عبدالغفار، عبدالحق، آل احمد سرور، خلیق انجم اور اب اطہر فاروقی جیسے اہم لوگ انجمن کے جنرل سکریٹری بنے اور انجمن نے ترقی بھی کی لیکن انجمن کے قیام کے فوراً بعد علامہ شبلی نعمانی کی وابستگی ایک یادگار اور تاریخی واقعہ تھی وہیں ان کی علاحدگی بھی ناقابل فراموش حادثہ بن گئی۔

شبلی صرف تین سال انجمن سے وابستہ رہے لیکن اس مختصر سی مدت میں بھی انھوں نے اپنی غیر معمولی انتھک محنت کے ذریعے اس کی ایک عمدہ و مستحکم بنیاد ڈالی۔ اس کے دائرۂ عمل کو وسیع کیا۔ کل ہند سطح پر اس کی غیر معمولی پہچان قائم کی۔ 1947 کے بعد جب مولوی عبدالحق پاکستان چلے گئے تو یہ انجمن وہاں بھی قائم ہوئی جو آج تک بڑے اہتمام اور انتظام سے چل رہی ہے۔ آج ہندستان و پاکستان میں اس انجمن کا جو نام ہے، وقار ہے، تاریخی رول ہے اس کے پیچھے ان بزرگوں کا خون جگر ہے، محنت شاقہ ہے جس میں سے پہلا اور اہم نام علامہ شبلی نعمانی کا ہے۔ اس لیے کہ وہ اس انجمن کے پہلے سکریٹری تھے اور سب جانتے ہیں کہ کام آگے بڑھانا اچھی بات ہے لیکن کام کو شروع کرنا اور اچھی بنیاد ڈالنا غیر معمولی عمل ہوا کرتا ہے اور انجمن کے تعلق سے یہ غیر معمولی کام علامہ شبلی نے انجام دیا جس کے لیے وہ ہمیشہ یاد کیے جاتے رہیں گے۔

□□□

شبلی اور انجمن ترقی اردو (ہند)

علی احمد فاطمی (شعبہ اردو الہ آباد یونیورسٹی، الہ آباد، یوپی)

شبلی انجمن ترقی اردو (ہند) کے پہلے جنرل سکریٹری تھے۔ اس عہدے پر وہ تین سال رہے۔ (1909-1903) اس طرح پہلے صدر پروفیسر آرنلڈ تھے اور تین نائب صدور ڈپٹی نذیر احمد، مولوی ذکا اللہ اور خواجہ الطاف حسین حالی۔ مولوی حامد علی صدیقی شبلی کے معاون یعنی اسسٹنٹ سکریٹری تھے۔ ان سب کا تعلق علی گڑھ یا علی گڑھ تحریک سے تھا۔ اس لیے شبلی اور انجمن کے رشتے کو سمجھنے کے لیے پہلے ان محرکات کو سمجھنا ہوگا جن کا تعلق علی گڑھ سے ہے اور شبلی کا بھی گہرا تعلق علی گڑھ اور سرسید سے رہا ہے جس کی مدت تقریباً سولہ سال ہے۔ (98-1883) بعض فکر و نظر کے اختلافات کے باوجود اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ شبلی کی سرسید سے ملاقات، رفاقت، دوستی اور سرپرستی نے شبلی کی فکری دنیا بدل کر رکھ دی بقول مولانا سلیمان ندوی:

"اب مولانا ایسی ہوا میں تھے جہاں ہر طرف نئے خیالات، نئے جذبات، زمانہ کے نئے اثرات قدیم و جدید کی آمیزش کے نئے انقلابات گرد و پیش تھے۔ ان اثرات اور جذبات کی نیرنگیوں میں حق و باطل اس طرح ملے تھے کہ ان کے علاحدہ کرنے کے لیے غیر معمولی بصیرت کی ضرورت تھی۔ الحمد للہ کہ مولانا میں یہ بصیرت موجود تھی"۔ (حیات شبلی ص130)

شبلی اور سرسید یا شبلی اور علی گڑھ ایسا موضوع ہے جس پر مفصل گفتگو کرنے کی ضرورت ہے۔ یہاں انجمن ترقی اردو اور شبلی سے متعلق علی گڑھ کے حوالے سے یہ عرض کرنا ہے کہ سرسید کی بے شمار علمی و اصلاحی کوششوں میں ایک کوشش یہ بھی تھی کہ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا انعقاد ہو۔ اس سلسلے میں تنظیم بھی قائم ہوئی۔ اس انعقاد کے پس منظر میں سرسید کا خیال یہ تھا کہ انگریزی سرکار نے ہندو مسلم نفاق کے ضمن میں فارسی کو سرکاری زبان سے اطلاق کر کے پہلے تو اردو کو جگہ دی اس کے بعد ہندی کو فروغ دینا شروع کیا۔ بظاہر یہ ایسی کوئی غلط بات تو نہ تھی لیکن انگریزوں کی نفاقی سازشوں اور اردو والوں کی کوششوں کو دیکھتے ہوئے ہندوؤں کی طرف سے بھی ہندی کے فروغ کی کوششیں شروع ہوگئیں۔ سرکاری دفتروں میں ہندی کا رائج ہونا، ابتدائی تعلیم میں ہندی کا ضروری ہونا وغیرہ ان کے خاص مقاصد تھے۔ ادھر سرسید نے 9 ستمبر 1873 کو الہ آباد میں ایک سنٹرل کمیٹی بنائی۔ (حیات شبلی ص322)

جس کے جواب میں علی گڑھ میں بھاشا سمردھن سبھا بنائی گئی (1887) غرض کہ ہندی اور اردو کے تنازعات پیدا ہوتے رہے اور انگریز اس کا سیاسی فائدہ اٹھاتے رہے۔ سر انتونی مکڈونل جو اس زمانے میں صوبہ بہار کے لفٹننٹ گورنر تھے وہ بعد میں یوپی میں بھی آئے اور اپنے ساتھ ہندی کی محبت لے کر آئے اور 18 اپریل 1900 کو ایک فرمان جاری کیا جس میں ناگری میں سرکاری کام کرنے کی ہدایت تھی۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک نفاقی اور سیاسی چال تھی جس سے اردو والوں میں بے چینی پھیل گئی۔ 29 اپریل 1900 کو لکھنؤ میں ایک ڈیفنس کمیٹی بنی اور 12 مئی 1900 کو علی گڑھ میں نواب لطف علی خاں رئیس چھتاری کی صدارت میں ایک جلسہ ہوا اور نواب محسن الملک نے جو اب سرسید کے بعد ان کے قائم مقام تھے ایک موثر تقریر کی اور طے پایا کہ حکومت میں ایک عرض داشت بھیجی جائے۔ (حیات شبلی ص322)

اس تقریر اور تحریر کا اتنا اثر ہوا کہ اردو کی یہ تحریک تیزی سے جڑ پکڑتی گئی اور چند ماہ کے بعد ہی لکھنؤ کے ورما لائبریری ہال میں ایک شاندار جلسے کا آغاز ہوا جس میں یو.پی. کے متعدد مقامات کے نمائندے شریک ہوئے اور جس میں مسلمانوں کے علاوہ ہندو اور عیسائی بھی تھے۔ اردو کا شور بلند ہوا تو لفٹننٹ گورنر متوجہ ہونے کے بجائے ناراض ہوئے اور انھوں نے بعض اردو دوستوں پر عتاب نازل کرنا شروع کیا جس کی وجہ سے وقتی طور پر یہ تحریک دب سی گئی لیکن چنگاری خاکستر میں دبی دبی سلگ رہی تھی۔ چنانچہ تھوڑے سے وقفے کے بعد دسمبر 1902 اور جنوری 1903 میں دہلی میں مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس ہوا۔ اس کانفرنس میں کئی تجویزیں، قراردادیں سامنے آگئیں اور کام کرنے کے کئی شعبے قائم کیے گئے۔ جن میں ایک شعبہ اردو کا تھا جس کا نام انجمن ترقی اردو رکھا گیا۔ اس شعبے میں درج ذیل عہدے دار بہ اتفاق رائے منتخب ہوئے۔

صدر: پروفیسر ٹامس آرنلڈ

نائب صدور: مولوی نذیر احمد، مولوی ذکا اللہ، مولانا الطاف حسین حالی

جنرل سکریٹری: مولانا شبلی نعمانی

نائب سکریٹری: مولوی حامد علی صدیقی سہارنپوری

اس طرح یہ شاخ جو بعد میں علاحدہ انجمن بن گئی اس کا قیام 1903 میں عمل میں آیا اور علامہ شبلی نعمانی اس کے پہلے جنرل سکریٹری نامزد ہوئے۔ یوں تو اس انجمن کے اغراض و مقاصد کی اپنی ایک تفصیل ہے لیکن مختصراً امام حبیب خاں کی زبان میں اس کا اصل مقصد تھا:

"انجمن ترقی اردو کے قیام کا مقصد اردو زبان کی ترقی اور اس کے فروغ کے لیے جد و جہد کرنا شامل ہے۔ زبان کو زیادہ سے زیادہ آسان بنانا تاکہ لوگ اردو زبان کو آسانی سے سیکھ سکیں۔ اس کا اہم مقصد ہے۔"

(شبلی کی علمی و ادبی خدمات ص306)

شبلی جس وقت اس کے سکریٹری مقرر ہوئے اس وقت وہ حیدرآباد میں تھے اور تصنیف و تالیف میں بے حد مصروف تھے۔ پھر بھی شبلی نے ابتدا میں اس عہدے اور تنظیم کو سنجیدگی سے لیا اور کئی اہم کام انجام دیے۔ وہ حیدرآباد میں رہے اور بے حد مصروف ہوتے ہوئے بھی انجمن ترقی اردو کے لیے کام کرنا شروع کر دیا۔ سرپرستان اور معاونان کو خطوط لکھے اور دوستوں سے انجمن کی رکنیت کے لیے گزارشیں کیں۔ اخبار کے مدیروں کو انجمن کا کارکن بنایا۔ ترجمے کا کام شروع کیا۔ عربی، فارسی اور انگریزی کی بعض اہم کتابوں کا انتخاب خود مولانا نے کیا اور دوستوں وادیبوں سے گزارش کی کہ وہ اپنی کتابیں انجمن کو بھیجیں۔ اس طرح کتابوں کا ذخیرہ ہونے لگا۔ کتب خانے کی شکل بننے لگی۔ ترجمے کا کام ہونے لگا اور سال دو سال کے درمیان خود انجمن کی طرف سے دو کتابیں (علمسۂ تعلیم اور رہنمایان ہند) شائع کیں۔ ظاہر ہے کہ اس کے پیچھے مولانا شبلی کا ہاتھ تھا جو ان دنوں غیر معمولی طور پر ادبی کام کر رہے تھے۔ علم الکلام، موازنۂ انیس و دبیر، سوانح مولانا روم جیسی کتابیں مولانا کے زیر قلم اور زیر وہن تھیں۔ حیات شبلی میں مولانا سلیمان ندوی لکھتے ہیں:

"اس زمانے میں انجمن کی مستعدی کا یہ عالم تھا کہ ہر مہینہ اس کی رپورٹ علی گڑھ گزٹ میں چھپتی تھی اور ملک میں اردو کے متعلق اس قدر جوش پیدا ہو گیا تھا کہ اخبار 'ہندوستانی' لکھنؤ جس کے ایڈیٹر گنگا پرساد ورما تھے، یہ شکایت چھاپی کہ انجمن نے اردو کے کام میں ہندو جماعت کو علاحدہ کر رکھا ہے۔ اس پر سکریٹری (مولانا شبلی مرحوم) نے اخباروں میں یہ تحریر شائع کی کہ یہ واقعہ کے خلاف ہے۔ انجمن کے قواعد میں اس خیال کا شائبہ بھی نہیں پایا جاتا اور عملی تردید اس خیال کی یہ ہے کہ انجمن نے سب سے پہلا انعام جو اردو تصنیف پر دیا وہ ایک ہندو مترجم منشی نرائن پرشاد ورما کو دیا اور ایک ایسی کتاب پر جو ہندو قوم کے ساتھ مخصوص تھی یعنی پیغمبران ہند جس میں شری کرشن جی اور گوتم بدھ کا تذکرہ اور ہندو مذہب کے اصول و عقائد ہیں۔۔۔ اس تحریر کا یہ اثر ہوا کہ بعض ہندو بزرگوں نے بھی انجمن کے ساتھ ہمدردی ظاہر کی اور اس کی ممبری قبول کی۔"

(حیات شبلی ص323,324)

(بقیہ صفحہ ۔ پر)

مدیر: اطہر فاروقی | Editor: Ather Farouqui
شریک مدیر: محمد عارف خاں | Joint Editor: Mohd. Arif Khan
پرنٹر پبلشر: شاہد خاں | Printer, Publisher: Shahid Khan
مطبوعہ ثمر آفسٹ پرنٹنگ پریس، دہلی
Printed at: Samar Offset Printing Press, Delhi
مالک: انجمن ترقی اردو (ہند)، اردو گھر، ۲۱۲- راؤز ایونیو، نئی دہلی-۱۱۰۰۰۲
Propiretor: Anjuman Taraqqi Urdu (Hind)
Urdu Ghar, 212-Rouse Avenue, New Delhi-110002
قیمت (فی شمارہ): دو روپے، سالانہ: ۸۵ روپے (بیرونی ممالک: آٹھ امریکن ڈالر)
Subscription. (Per Issue): Rs. 2/-, Yearly: 85/-
(Foreign Countries: US $ 8)
http://www.atuh.org. Phones: 23237212, 23237214